سرمایۂ اردو

11

ACADEMIC YEAR 2018-19

Sr.No: 14214007
Code: 55971XF

2018-19

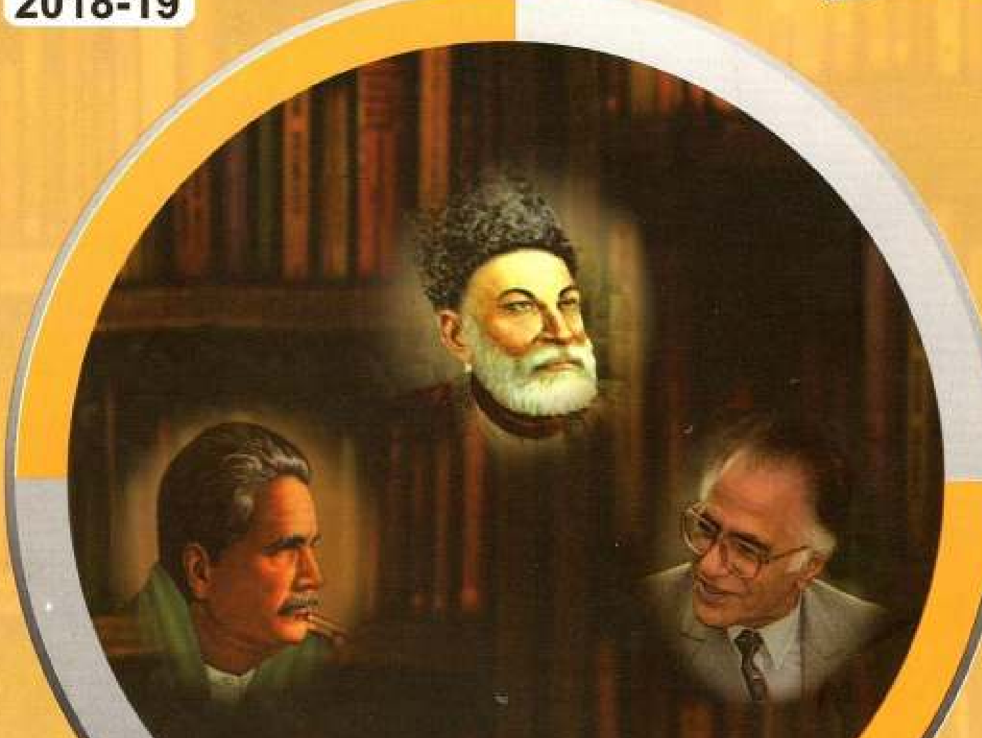

پنجاب کریکولم اینڈ ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور

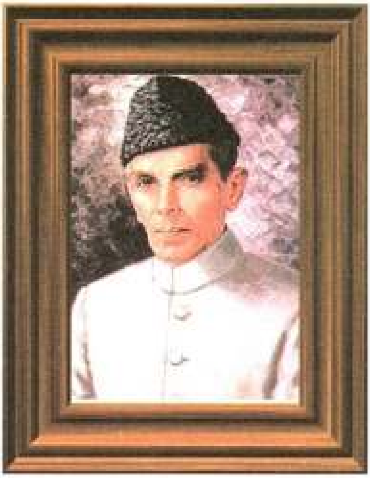

''تعلیم پاکستان کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ دُنیا اتنی تیزی سے ترقی کر رہی ہے کہ تعلیمی میدان میں مطلوبہ پیش رفت کے بغیر ہم نہ صرف اقوامِ عالم سے پیچھے رہ جائیں گے بلکہ ہوسکتا ہے کہ ہمارا نام و نشان ہی صفحۂ ہستی سے مٹ جائے۔''

قائدِاعظم محمد علی جناحؒ، بانی پاکستان
(26 ستمبر 1947ء۔ کراچی)

قومی ترانہ

پاک سَرزمین شاد باد　　کِشورِ حسین شاد باد
تُو نشانِ عزمِ عالی شان　　ارضِ پاکستان
مرکزِ یقین شاد باد

پاک سَرزمین کا نِظام　　قُوتِ اُخوتِ عوام
قوم ، مُلک ، سلطنت　　پایندہ تابندہ باد
شاد باد منزلِ مُراد

پرچمِ ستارہ و ہِلال　　رہبرِ ترقّی و کمال
ترجمانِ ماضی، شانِ حال　　جانِ اِستقبال
سایۂ خدائے ذُوالجلال

جعلی کُتب کی روک تھام کے لیے پنجاب کریکولم اینڈ ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور کی درسی کُتب کے سرِورق پر مستطیل شکل میں ایک ''حفاظتی نشان'' چسپاں کیا گیا ہے۔ ترچھا کر کے دیکھنے پر اس نشان میں موجود مونوگرام کا نارنجی رنگ، سبز رنگ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مونوگرام کے نیچے موجود سفید جگہ کو سِکّے سے کُھرچنے پر "PCTB" لکھا ظاہر ہوتا ہے۔ تصدیق کے لیے ''حفاظتی نشان'' پر دیے گئے کوڈ کو "8070" پر "PCTB(Space)Code No." لکھ کر SMS کریں اور انعامی سکیم میں شامل ہوں۔ اگر SMS کے جواب میں ''حفاظتی نشان'' پر درج سیریل نمبر موصول ہو تو کتاب اصلی ہے۔ درسی کُتب خریدتے وقت یہ ''حفاظتی نشان'' ضرور دیکھیں۔ اگر کسی کتاب پر یہ نشان موجود نہ ہو یا اس میں ردّوبدل کیا گیا ہو تو ایسی کتاب ہرگز نہ خریدیں۔

سرمایۂ اُردُو

(اُردُو لازمی)

گیارھویں جماعت کے لیے

پنجاب کریکولم اینڈ ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور

جملہ حقوق بحق پنجاب کریکولم اینڈ ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور محفوظ ہیں۔
تیار کردہ: پنجاب کریکولم اینڈ ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور
منظور کردہ: قومی ریویو کمیٹی، وفاقی وزارت تعلیم (شعبہ نصاب سازی) حکومتِ پاکستان، اسلام آباد۔
اس کتاب کا کوئی حصہ نقل یا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اسے ٹیسٹ پیپر،
گائیڈ بکس، خلاصہ جات، نوٹس یا امدادی کتب کی تیاری میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔

مؤلفین

- محمد زبیر ساہی
- پروفیسر ایاز اصغر شاہین
- ڈاکٹر محمد خان اشرف

مدیران

- پروفیسر افتخار الدین سہیل
- پروفیسر حفیظ صدیقی

نگران

- ظہیر کاشر وٹو

ڈائریکٹر مسودات: ڈاکٹر مبین اختر

سینئر آرٹسٹ/ڈپٹی ڈائریکٹر گرافکس: مسز عائشہ وحید

ناشر: جمال بک ڈپو　　　　مطبع: اسحاق الفتح پریس۔لاہور

تاریخ اشاعت	ایڈیشن	طباعت	تعداد اشاعت	قیمت
اپریل 2018ء	اول	35	15,000	51.00

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	مصنفین/شعرا	صفحہ
	حصہ نثر		
1	اسوۂ حسنہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم	سید سلیمان ندویؒ	1
2	اپنی مدد آپ	سر سید احمد خاں	6
3	سر سید کے اخلاق و خصائل	مولانا الطاف حسین حالی	10
4	ابوالقاسم زہراوی	حمید عسکری	16
5	ادیب کی عزت	پریم چند	20
6	اوورکوٹ	غلام عباس	28
7	سفارش	احمد ندیم قاسمی	35
8	چراغ کی لَو	ہاجرہ مسرور	40
9	مکتوباتِ غالب	مرزا اسد اللہ خاں غالب	45
10	مکتوباتِ اقبالؒ	علامہ محمد اقبالؒ	48
11	لاہور کا جغرافیہ	پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس	51
12	دوستی کا پھل	شفیع عقیل	57
13	کیا واقعی دنیا گول ہے؟	ابنِ انشا	64
14	اور آنا گھر میں مرغیوں کا	مشتاق احمد یوسفی	67
	حصہ نظم		
1	حمد	(امیر احمد) امیر مینائی	73
2	نعت	ماہر القادری	74
3	تسلیم و رضا	نظیر اکبر آبادی	76
4	میدانِ کربلا میں صبح کا منظر	میر انیس	78

5	مستقبل کی جھلک	مولانا ظفر علی خاں	80
6	برسات	اختر شیرانی	82
7	ہلالِ استقلال	حفیظ جالندھری	84
8	خطاب بہ جوانانِ اسلام	علامہ محمد اقبالؒ	86
9	پیغام	علامہ محمد اقبالؒ	87
10	ایبسٹریکٹ آرٹ	سید محمد جعفری	89
11	قطعات	مرزا محمود سرحدی	91
12	لوکل بس	دلاور فگار	93
13	وحدانیت	مست توکلی (ترجمہ: طارق قریشی)	95

حصہ غزل

1	جس سر کو غرور آج ہے ، یاں تاج وری کا	میر تقی میر	97
	گل کو ہوتا صبا ! قرار اے کاش!	میر تقی میر	
2	ہوائے دورِ مئے خوش گوار ، راہ میں ہے	حیدر علی آتش	99
	یہ آرزو تھی ، تجھے گل کے روبرو کرتے	حیدر علی آتش	
3	پھرے راہ سے وہ ، یہاں آتے آتے	میرزا خاں داغ	101
	خاطر سے یا لحاظ سے ، میں مان تو گیا	میرزا خاں داغ	
4	اثر اس کو ، ذرا نہیں ہوتا	مومن خاں مومن	103
	ٹھانی تھی دل میں ، اب نہ ملیں گے کسی سے ہم	مومن خاں مومن	
5	بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں	حسرت موہانی	105
	رسمِ جفا کامیاب ، دیکھیے کب تک رہے	حسرت موہانی	
6	نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش ، دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا	فیض احمد فیض	107
	کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں، کب ہات میں تیرا ہات نہیں	فیض احمد فیض	
7	کچھ غلط بھی تو نہیں تھا ، مرا تنہا ہونا	احمد ندیم قاسمی	109
	اَب تو کچھ اور ہی ، اعجاز دکھایا جائے	احمد ندیم قاسمی	
	فرہنگ		111

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ٥

سید سلیمان ندویؒ
(1884ء - 1953ء)

اُسوۂ حسنہ صلّی اللہُ علیہ وآلہٖ وسلّم

خدا کی محبت کا اہل اور اس کے پیار کا مستحق بننے کے لیے ہر مذہب نے ایک ہی تدبیر بتائی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس مذہب کے شارع اور طریقے کے بانی نے جو عمدہ نصیحتیں کی ہیں، ان پر عمل کیا جائے، لیکن اسلام نے اس سے بہتر تدبیر اختیار کی ہے۔ اس نے اپنے پیغمبرؐ کا عملی مجسمہ سب کے سامنے رکھ دیا ہے اور عملی مجسمے کی پیروی اور اتباع کو خدا کی محبت کا اہل اور اس کے پیار کا مستحق بننے کا ذریعہ بتایا ہے۔ چناں چہ اسلام میں دو چیزیں ہیں، کتاب اور سنت۔ کتاب سے مراد خدا کے احکام ہیں جو قرآن مجید کے ذریعے سے ہم تک پہنچے ہیں اور سنت جس کے لغوی معنی راستے کے ہیں، وہ راستہ کہ جس پر پیغمبرِ اسلام صلّی اللہُ علیہ وآلہٖ وسلّم خدا کے احکام پر عمل کرتے ہوئے گزرے یعنی آپؐ کا عملی نمونہ جس کی تصاویر احادیث میں بہ صورت الفاظ درج ہیں۔ غرض یہ کہ ایک مسلمان کی کامیابی اور تکمیل روحانی کے لیے جو چیز ہے وہ سنت نبوی صلّی اللہُ علیہ وآلہٖ وسلّم ہے۔

وہ تمام اشخاص جو کسی مذہب کے حلقۂ اطاعت میں داخل ہوں ناممکن ہے کہ وہ کسی ایک ہی صنفِ انسانی سے تعلق رکھتے ہوں۔ اس دنیا کی بنیاد اختلافِ عمل پر ہے۔ باہمی تعاون اور مختلف پیشوں اور کاموں ہی کے ذریعے سے یہ دنیا چل رہی ہے۔ اس میں بادشاہ یا رئیس، جمہور اور حکام بھی ضروری ہیں اور محکوم، مطیع اور فرماں بردار رعایا بھی، امن و امان کے قیام کے لیے قاضیوں اور ججوں کا ہونا بھی ضروری ہے اور فوجوں کے سپہ سالاروں اور افسروں کا بھی، غریب بھی ہیں اور دولت مند بھی، رات کے زاہد و عابد بھی ہیں اور دن کے سپاہی و مجاہد بھی، اہل و عیال بھی ہیں اور دوست احباب بھی، تاجر اور سوداگر بھی ہیں اور امام اور پیشوا بھی۔ غرض اس دنیا کا نظم و نسق مختلف اصناف کے وجود اور قیام ہی پر موقوف ہے اور ان تمام اصناف کو اپنی اپنی زندگی کے لیے عملی مجسمے اور نمونے کی ضرورت ہے۔ اسلام ان تمام انسانوں کو سنت نبوی صلّی اللہُ علیہ وآلہٖ وسلّم کے اتباع کی دعوت دیتا ہے۔

انسانوں کے ہر طبقے اور صنف کے لیے سیرت پاک صلّی اللہُ علیہ وآلہٖ وسلّم میں نصیحت پذیری اور عمل کے لیے درس اور سبق موجود ہے۔ ایک حاکم کے لیے محکوم کی زندگی، ایک دولت مند کے لیے غریب کی زندگی اور ایک غریب کے لیے دولت مند کی زندگی کامل مثال اور نمونہ نہیں بن سکتی۔ اس لیے ضرورت ہے کہ عالم گیر اور دائمی پیغمبر کی زندگی ان تمام مختلف مناظر کے رنگ برنگ پھولوں کا گلدستہ ہو۔ ہم چلتے پھرتے بھی ہیں، اٹھتے بیٹھتے بھی، کھاتے پیتے بھی ہیں، سوتے جاگتے بھی، ہنستے بھی ہیں روتے بھی، پہنتے بھی ہیں اتارتے بھی، سیکھتے بھی ہیں سکھاتے بھی، مرتے بھی ہیں مارتے بھی، کھاتے بھی ہیں اور کھلاتے بھی، احسان لیتے بھی ہیں اور کرتے بھی ہیں۔ اپنی جان دیتے بھی ہیں اور بچاتے بھی، عبادت و دعا بھی کرتے ہیں اور کاروبار بھی، مہمان بھی بنتے ہیں اور میزبان بھی۔ ہمیں ان تمام اُمور، جو ہمارے مختلف افعالِ جسمانی سے تعلق رکھتے ہیں، کے لیے عملی نمونے کی ضرورت ہے، جو ہر نئی حالت کے پیش آنے میں ایک نئی ہدایت کا سبق اور نئی رہنمائی کا درس دے۔

علاوہ ازیں وہ افعال جن کا تعلق دل و دماغ سے ہے اور جن کی تعبیر ہم اعمالِ قلب یا جذبات اور احساسات سے کرتے ہیں۔ ہر آن ہم ایک نئے قلبی عمل، جذبے یا احساس سے متاثر ہوتے ہیں۔ ہم کبھی راضی ہیں، کبھی ناراض کبھی خوش ہیں کبھی غم زدہ، کبھی مصائب سے دوچار ہیں اور کبھی نعمتوں سے مالا مال، کبھی ناکام ہوتے ہیں اور کبھی کامیاب، ان سب حالتوں میں ہم مختلف جذبات کے ماتحت ہوتے ہیں۔ اخلاقِ فاضلہ کا تمام تر انحصار انھی جذبات اور احساسات کے اعتدال اور باقاعدگی پر ہے، ان سب کے لیے ہم کو ایک عملی سیرت کی حاجت ہے۔

عزم واستقلال، شجاعت، صبر، شکر، توکل، رضا، تقدیر، مصیبتوں کی برداشت، قربانی، قناعت، استغنا، ایثار، جود، تواضع، خاکساری، مسکنت، نشیب وفراز، بلند و پست، تمام اخلاقی پہلوؤں کے لیے جو مختلف انسانوں کو مختلف حالتوں میں یا ہر انسان کو مختلف صورتوں میں پیش آتے ہیں، ہمیں عملی ہدایت اور مثال کی ضرورت ہے جو صرف پیغمبرِ اسلامؐ کی سوانح میں مل سکتی ہیں۔

غرض ایک ایسی شخصی زندگی جو ہر طائفۂ انسانی اور ہر حالتِ انسانی کے مختلف مظاہر اور ہر قسم کے صحیح جذبات اور کامل اخلاق کا مجموعہ ہو، صرف محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی سیرت ہے۔ اگر دولت مند ہو تو مکّے کے تاجر اور بحرَین کے خزینہ دار کی تقلید کرو۔ اگر غریب ہو تو شعبِ ابی طالب میں محصور اور مدینے کے مہمان کی کیفیت سنو۔ اگر بادشاہ ہو تو سلطانِ عرب کا حال پڑھو۔ اگر رعایا ہو تو قریش کے محکوم کو ایک نظر دیکھو۔ اگر فاتح ہو تو بدر و حنین کے سپہ سالار پر نگاہ دوڑاؤ۔ اگر تم نے شکست کھائی ہے تو معرکۂ اُحد سے عبرت حاصل کرو۔ اگر تم استاد اور معلّم ہو تو صُفہ کی درس گاہ کے معلّمِ قُدس کو دیکھو۔ اگر شاگرد ہو تو روح الامین کے سامنے بیٹھنے والے پر نظر جماؤ۔ اگر واعظ اور ناصح ہو تو مسجدِ مدینہ کے منبر پر کھڑے ہونے والے کی باتیں سنو۔ اگر تنہائی اور بے کسی کے عالم میں حق کی مُنادی کا فرض انجام دینا چاہتے ہو تو مکّے کے بے یار و مددگار نبی کا اُسوۂ حسنہ تمھارے سامنے ہے۔ اگر تم حق کی نصرت کے بعد اپنے دشمنوں کو زیر اور مخالفوں کو کم زور بنا چکے ہو تو فاتحِ مکہ کا نظارہ کرو۔ اگر اپنے کاروبار اور دنیاوی جدوجہد کا نظم ونسق درست کرنا چاہتے ہو تو بنی نضیر، خیبر اور فدک کی زمینوں کے مالک کے کاروبار اور نظم ونسق کو دیکھو۔ اگر سفری کاروبار میں ہو تو بصریٰ کے کاروانِ سالار کی مثالیں ڈھونڈو۔ اگر عدالت کے قاضی اور پنچایت کے ثالث ہو تو کعبے میں نورِ آفتاب سے پہلے داخل ہونے والے ثالث کو دیکھو جو حجرِ اسود کو کعبے کے ایک کونے میں نصب کر رہا ہے۔ مدینے کی کچی مسجد کے صحن میں بیٹھنے والے منصف کو دیکھو جس کی نظرِ انصاف میں شاہ و گدا اور امیر و غریب برابر تھے۔ اگر تم بیویوں کے شوہر ہو تو خدیجہؓ و عائشہؓ کے شوہر کی حیاتِ پاک کا مطالعہ کرو، اگر اولاد والے ہو تو فاطمہؑ کے باپ اور حسنؑ و حسینؑ کے نانا کا حال پوچھو۔ غرض تم جو کوئی بھی ہو اور کسی حال میں بھی ہو تمھاری زندگی کے لیے نمونہ، تمھاری سیرت کی درستی واصلاح کے لیے سامان، تمھارے ظلمت خانہ کے لیے ہدایت کا چراغ اور رہنمائی کا نور محمد صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی جامعیت کبریٰ کے خزانے میں ہر وقت اور ہمہ دم مل سکتا ہے۔ اس لیے طبقۂ انسانی کے ہر طالبِ علم اور نورِ ایمانی کے ہر متلاشی کے لیے صرف رسول صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی سیرت، ہدایت کا نمونہ اور نجات کا ذریعہ ہے۔

ایسی کامل و جامع ہستی جو اپنی زندگی میں ہر نوع اور ہر قسم، ہر گروہ اور ہر صنفِ انسانی کے لیے ہدایت کی مثالیں اور نظیریں رکھتی ہو، وہی اس لائق ہے جو اس اَصناف واَنواع سے بھری ہوئی دنیا کی عالم گیر اور دائمی رہنمائی کا کام سرانجام دے، جو غیظ وغضب اور رحم و کرم،

جود وسخا اور فقر وفاقہ، شجاعت و بہادری اور رحم دلی، رقیق القلبی، دنیا اور دین دونوں کے لیے ہمیں اپنی زندگی کے نمونوں سے بہرہ مند کردے، جو دنیا کی بادشاہی کے ساتھ آسمان کی بادشاہی اور اس آسمان کی بادشاہی کے ساتھ دنیا کی بادشاہی کی بھی بشارت دے اور دونوں بادشاہیوں کے قواعد وقوانین اور دستور العمل کو اپنی زندگی میں برت کر دکھاوے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا وجودِ مبارک ایک آفتابِ عالم تاب تھا جس سے اونچے پہاڑ، ریتلے میدان، بہتی نہریں، سرسبز کھیت، اپنی اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق تابش اور نور حاصل کرتے تھے یا ابرِ باراں تھا، جو پہاڑ اور جنگل، میدان اور کھیت، ریگستان اور باغ ہر جگہ برستا تھا اور ہر ٹکڑا اپنی اپنی استعداد کے مطابق سیراب ہو رہا تھا، قسم قسم کے درخت اور رنگا رنگ پھول اور پتے جم رہے تھے اور اُگ رہے تھے۔

بادشاہ ہو یا گدا، امیر ہو یا غریب، حاکم ہو یا محکوم، قاضی ہو یا گواہ، افسر ہو یا سپاہی، استاد ہو یا شاگرد، عابد وزاہد ہو یا کاروباری، غازی ہو یا شہید، توحید کا نور، اخلاص کی رو، قربانی کا ولولہ، خلق کی ہدایت اور راہنمائی کا جذبہ اور بالآخر ہر کام میں خدا کی رضا طلبی کا جوش ہر ایک کے اندر کام کر رہا تھا۔ وہ جو کچھ بھی ہو، جہاں بھی ہو، یہ فیضانِ حق سب میں یکساں اور برابر تھا۔ راستوں، رنگوں اور مذاقوں کا اختلاف تھا مگر خدا ایک تھا، قرآن ایک تھا، رسولؐ ایک تھا اور قبلہ ایک تھا۔ ہر رنگ، ہر راستہ اور ہر کام سے مقصود دنیا کی درستی، خلق کی ہمدردی، خدا کے نام کی اونچائی اور حق کی ترقی تھی اور ان کے سوا کوئی چیز ان کے پیشِ نظر نہ تھی۔

یہ دنیا انسانی مزاجوں اور انسانی صلاحیتوں اور استعدادوں کے اختلاف کا نام ہے تو یقین کرو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی جامع شخصیت کے سوا اس کا کوئی آخری اور دائمی اور عالم گیر راہنما نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اعلان فرمایا کہ:

''اگر تمھیں خدا کی محبت کا دعویٰ ہے، تو آؤ میری پیروی کرو، اللہ بھی تم سے محبت کرے گا۔''

(خطباتِ مدراس)

مشق

1- سبق ''اُسوۂ حسنہ'' کی روشنی میں مندرجہ ذیل جملے مکمل کریں:

- i- اسلام میں دو چیزیں ہیں، کتاب اور..................
- ii- مسلمان کی کامیابی اور تکمیل روحانی کے لیے جو چیز ہے وہ.................. ہے۔
- iii- اس دُنیا کی بنیاد.................. عمل پر ہے۔
- iv- اسلام تمام انسانوں کو سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے.................. کی دعوت دیتا ہے۔
- v- ہمیں عملی ہدایت اور مثال کی ضرورت ہے جو صرف.................. کی سوانح میں مل سکتی ہے۔
- vi- ہدایت کا چراغ اور رہنمائی کا نور.................. کی جامعیت کبریٰ کے خزانے میں ہر وقت اور ہمہ دم مل سکتا ہے۔
- vii- محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا وجودِ مبارک ایک آفتاب.................. تھا۔
- viii- یہ فیضان حق سب میں.................. اور برابر تھا۔

2- سبق ''اسوۂ حسنہ'' کو مدِنظر رکھتے ہوئے درج ذیل سوالات کے درست جواب کے شروع میں (✓) لگائیں۔

i- خدا کی محبت کا اہل اور اُس کے پیار کا مستحق بننے کے لیے اسلام نے:

ا۔ احکامِ الٰہی سب کے سامنے رکھ دیے ہیں۔ ب۔ انبیا کی حیات سب کے سامنے رکھ دی ہے۔

ج۔ اپنے پیغمبرؐ کا عملی مجسمہ سب کے سامنے رکھ دیا ہے۔ د۔ خلفائے راشدین کا اُسوہ سب کے سامنے رکھ دیا ہے۔

ii- ایک مسلمان کی کامیابی اور تکمیل روحانی کے لیے جو چیز ہے:

ا۔ وہ سنت نبویؐ ہے ب۔ وہ اسوۂ اسلاف ہے

ج۔ وہ اسوۂ صحابہؓ ہے د۔ وہ اسوۂ انبیاؑ ہے

iii- اس دنیا کی بنیاد ہے:

ا۔ اختلافِ عمل پر ب۔ تعاونِ عمل پر

ج۔ اجتماعی عمل پر د۔ ذاتی عمل پر

iv- مکہ کے تاجر اور بحرین کے خزینہ دار کی تقلید کرو اگر:

ا۔ غریب ہو تو ب۔ دولت مند ہو تو

ج۔ جوان ہو تو د۔ سفری کاروبار میں ہو تو

v- فاتح مکہ کا نظارہ کرو اگر تم:

ا۔ دُشمنوں اور مخالفوں کو شکست دے چکے ہو۔ ب۔ دُشمنوں اور مخالفوں کو کم زور بنا چکے ہو۔

ج۔ دُشمنوں اور مخالفوں کو مطیع بنا چکے ہو۔ د۔ دُشمنوں کو زیر اور مخالفوں کو کم زور بنا چکے ہو۔

3- سبق اسوۂ حسنہ کو مدِنظر رکھ کر کالم الف کے اندراج کا ربط کالم ب سے قائم کریں اور جواب کالم ج میں لکھیں:

کالم الف	کالم ب	کالم ج
سنت	خانہ کعبہ	
محصور	مسجد	
حجرِ اسود	صفہ	
استاد اور معلم	شعب ابی طالب	
واعظ	راستہ	

4۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب سبق کے متن کے مطابق تحریر کریں جو زیادہ سے زیادہ تین سطور پر مشتمل ہوں۔

i- سنتِ نبویؐ سے کیا مراد ہے؟

ii- کتاب سے کیا مراد ہے؟

iii- خدا کی محبت کا اہل کیسے بنا جا سکتا ہے؟

iv- اسلام تمام انسانوں کو کس کی اتباع کی دعوت دیتا ہے؟
v- حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سیرتِ طیبہ کن کے لیے ہدایات کا نمونہ اور نجات کا ذریعہ ہے؟
5- درج ذیل اقتباسات کی تشریح سیاق وسباق کے حوالے سے کریں:
"محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا وجود مبارک ۔۔۔۔۔ جم رہے تھے اور اُگ رہے تھے۔"
"بادشاہ ہو یا گدا ۔۔۔۔۔ پیشِ نظر نہ تھی"
6- مولانا شبلی نعمانیؒ اور سید سلیمان ندویؒ کی مرتب شدہ سیرت النبیؐ کا مطالعہ کریں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی امانت و دیانت کا ایک واقعہ اپنے الفاظ میں لکھیں۔

امتحانی نقطۂ نگاہ سے عبارت کی تشریح کا سوال تین اجزا کا حامل ہوتا ہے: حوالہ متن، سیاق وسباق اور تشریح۔ جواب دیتے ہوئے تینوں اجزا میں مندرجہ ذیل طریقہ اختیار کیا جائے۔

حوالہ متن:

اقتباس کے بارے میں بتایا جائے کہ وہ کس سبق کا حصہ ہے اور سبق کے مصنف کا نام کیا ہے۔

سیاق وسباق:

سیاق وسباق دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک مثالی، دوسرا اجمالی۔ وہ سیاق وسباق مثالی ہے، جو اقتباس کا موقع ومحل بتائے یعنی اقتباس سے پہلے اور بعد کے مقامات کا ذکر کرے۔ ایسا مثالی سیاق وسباق اس وقت آسانی سے لکھا جا سکتا ہے، جب اقتباس ایسے سبق میں سے لیا گیا ہو جس میں کہانی کا عنصر موجود ہو۔ دوسرا اجمالی سیاق وسباق ہے جو اقتباس سے متعلقہ سبق کے اہم نکات کو بالترتیب مختصراً بیان کر دے۔ اجمالی سیاق وسباق ان اسباق کی ضرورت بن جاتا ہے جن میں کہانی کا عنصر نہ پایا جاتا ہو۔ لیکن یہ بات پیشِ نظر رہے کہ انٹر کے امتحان میں ہر دو قسم کے سیاق وسباق کی طوالت آٹھ سے بارہ سطور کے درمیان رہنی چاہیے۔

تشریح:

عبارات کی تشریح کا مقصد طلبہ کی اس صلاحیت کو جانچنا ہے کہ وہ عبارات کی تفہیم اور وضاحت کی کس قدر اہلیت رکھتے ہیں اور مطالبِ عبارت کو اپنے الفاظ میں کس قدر خوبی سے سمجھا سکتے ہیں۔ طلبہ کو چاہیے کہ وہ مشکل الفاظ وتراکیب کے معانی اور متبادل لکھیں پھر متعلقہ عبارت میں پیش کیے گئے خیالات اور مثالیں (اگر ہوں) کی وضاحت ترتیب وار کر دیں۔ ایسا کرتے ہوئے تشریح عموماً اصل عبارت سے تین گنا ہو جانی چاہیے لیکن تشریح کرتے ہوئے سبق کی حدود میں رہنا بہر حال ضروری ہے۔

سر سید احمد خاں

(1817ء-1898ء)

اپنی مدد آپ

خدا اُن کی مدد کرتا ہے جو آپ اپنی مدد کرتے ہیں۔

یہ ایک نہایت عمدہ اور آزمودہ مقولہ ہے۔ اس چھوٹے سے فقرے میں انسانوں کا اور قوموں کا اور نسلوں کا تجربہ جمع ہے۔ ایک شخص میں اپنی مدد کرنے کا جوش اس کی سچی ترقی کی بنیاد ہے اور جبکہ یہ جوش بہت سے شخصوں میں پایا جاوے تو وہ قومی ترقی اور قومی طاقت اور قومی مضبوطی کی جڑ ہے۔ جبکہ کسی شخص کے لیے یا کسی گروہ کے لیے کوئی دوسرا کچھ کرتا ہے تو اس شخص میں سے یا اس گروہ میں سے وہ جوش اپنی آپ مدد کرنے کا کم ہو جاتا ہے اور ضرورت اپنی آپ مدد کرنے کی اس کے دل سے مٹتی جاتی ہے اور اسی کے ساتھ غیرت جو ایک نہایت عمدہ قوت انسان میں ہے اور اسی کے ساتھ عزت جو اصلی چمک دمک انسان کی ہے از خود جاتی رہتی ہے اور جبکہ ایک قوم کی قوم کا یہ حال ہو تو وہ ساری قوم دوسری قوموں کی آنکھ میں ذلیل اور بے عزت ہو جاتی ہے۔

یہ ایک نیچر کا قاعدہ ہے کہ جیسا مجموعہ قوم کی چال چلن کا ہوتا ہے۔ یقینی اُسی کے موافق اس کے قانون اور اسی کے مناسب حال گورنمنٹ ہوتی ہے۔ جس طرح کہ پانی خود اپنی پنسال میں آجاتا ہے، اسی طرح عمدہ رعایا پر عمدہ حکومت ہوتی ہے اور جاہل وخراب و ناتربیت یافتہ رعایا پر ویسی ہی اکھڑ حکومت کرنی پڑتی ہے۔

تمام تجربوں سے ثابت ہوا ہے کہ کسی ملک کی خوبی وعمدگی اور قدر و منزلت بہ نسبت وہاں کی گورنمنٹ کے عمدہ ہونے کے زیادہ تر اس ملک کی رعایا کے چال چلن، اخلاق و عادت، تہذیب و شائستگی پر منحصر ہے، کیونکہ قوم شخصی حالتوں کا مجموعہ ہے اور ایک قوم کی تہذیب درحقیقت ان مرد و عورت و بچوں کی شخصی ترقی ہے، جن سے وہ قوم بنی ہے۔

قومی ترقی مجموعہ ہے، شخصی محنت، شخصی عزت، شخصی ایمانداری، شخصی ہمدردی کا۔ اسی طرح قومی تنزل مجموعہ ہے شخصی سستی، شخصی بےعزتی شخصی بے ایمانی، شخصی خود غرضی کا اور شخصی برائیوں کا۔ ناتہذیبی و بدچلنی جو اخلاق و تمدنی یا باہمی معاشرت کی بدیوں میں شمار ہوتی ہے، درحقیقت وہ خود اسی شخص کی آوارہ زندگی کا نتیجہ ہے۔ اگر ہم چاہیں کہ بیرونی کوشش سے ان برائیوں کو جڑ سے اُکھاڑ ڈالیں اور نیست و نابود کر دیں، تو یہ برائیاں کسی اور نئی صورت میں اس سے بھی زیادہ زور شور سے پیدا ہو جاویں گی۔ جب تک شخصی زندگی اور شخصی چال چلن کی حالتوں کو ترقی نہ کی جاوے۔

اے میرے عزیز ہم وطنو! اگر یہ رائے صحیح ہے تو اس کا یہ نتیجہ ہے کہ قوم کی سچی ہمدردی اور سچی خیر خواہی کرو۔ غور کرو کہ تمھاری قوم کی شخصی زندگی اور شخصی چال چلن کس طرح پر عمدہ ہو تاکہ تم بھی ایک معزز قوم ہو۔ کیا جو طریقہ تعلیم و تربیت کا، بات چیت کا وضع ولباس کا، سیر سپاٹے کا، شغل اشغال کا، تمھاری اولاد کے لیے ہے، اس سے ان کی شخصی چال چلن، اخلاق و عادات، نیکی و سچائی میں ترقی ہو سکتی

ہے؟ حاشا وکلا۔

جبکہ ہر شخص اور کل قوم خود اپنی اندرونی حالتوں سے آپ اپنی اصلاح کر سکتی ہے تو اس بات کی اُمید پر بیٹھے رہنا کہ بیرونی زور انسان کی یا قوم کی اصلاح و ترقی کرے کس قدر افسوس بلکہ نادانی کی بات ہے۔ وہ شخص درحقیقت غلام نہیں ہے جس کو ایک خدا نا ترس نے جو اس کا ظالم آقا کہلایا جاتا ہے خرید لیا ہے یا ایک ظالم اور خود مختار بادشاہ یا گورنمنٹ کی رعیت ہے بلکہ درحقیقت وہ شخص اصلی غلام ہے جو بداخلاقی، خودغرضی، جہالت اور شرارت کا مطیع اور اپنی خودغرضی کی غلامی میں مبتلا اور قومی ہمدردی سے بے پرواہ ہے۔ وہ قومیں جو اس طرح دل میں غلام ہیں وہ بیرونی زوروں سے، یعنی عمدہ گورنمنٹ یا عمدہ قومی انتظام سے آزاد نہیں ہو سکتیں جب تک کہ غلامی کی یہ دلی حالت دور نہ ہو۔ اصل یہ ہے کہ جب تک انسانوں میں یہ خیال ہے کہ ہماری اصلاح و ترقی گورنمنٹ پر یا قوم کے عمدہ انتظام پر منحصر ہے، اس وقت تک کوئی مستقل اور برتاؤ میں آنے کے قابل نتیجہ اصلاح و ترقی کا قوم میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ گو کیسی ہی عمدہ تبدیلیاں گورنمنٹ یا انتظام میں کی جاویں، وہ تبدیلیاں فانوسِ خیال سے کچھ زیادہ رتبہ نہیں رکھتیں، جس میں طرح طرح کی تصویریں پھرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں، مگر جب دیکھو تو کچھ بھی نہیں۔

انسان کی قومی ترقی کی نسبت ہم لوگوں کے یہ خیال ہیں کہ کوئی خضر ملے، گورنمنٹ فیاض ہو اور ہمارے سب کام کر دے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ہر چیز ہمارے لیے کی جاوے اور ہم خود نہ کریں۔ یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اگر اس کو ہادی اور رہنما بنایا جاوے تو تمام قوم کی دلی آزادی کو برباد کر دے اور آدمیوں کو انسان پرست بنا دے۔ حقیقت میں ایسا ہونا قوت کی پرستش ہے اور اس کے نتائج انسان کو ایسا ہی حقیر بنا دیتے ہیں جیسے کہ صرف دولت کی پرستش سے انسان حقیر و ذلیل ہو جاتا ہے۔

بڑا سچا مسئلہ اور نہایت مضبوط جس سے زیادہ دنیا کی معزز قوموں نے عزت پائی ہے وہ اپنی آپ مدد کرنا ہے۔ جس وقت لوگ اس کو اچھی طرح سمجھیں گے اور کام میں لاویں گے تو پھر خضر کو ڈھونڈنا بھول جاویں گے۔ اوروں پر بھروسے اور اپنی مدد آپ، یہ دونوں اصول ایک دوسرے کے بالکل مخالف ہیں۔ پچھلا انسان کی بدیوں کو برباد کرتا ہے اور پہلا خود انسان کو۔

قومی انتظام یا عمدہ قوانین کے اجرا کی خواہش، یہ بھی ایک قدیمی غلط خیال ہے۔ سچا اصول وہ ہے جو ولیم ڈراگن نے ڈبلن کی نمائش گاہِ دستکاری میں کہا تھا جو ایک بڑا خیر خواہ آئرلینڈ کا تھا۔

اس نے کہا کہ ''جس وقت میں آزادی کا لفظ سنتا ہوں، اسی وقت مجھ کو میرا ملک اور میرے شہر کے باشندے یاد آتے ہیں۔ ہم اپنی آزادی کے لیے بہت سی باتیں سنتے آئے ہیں، مگر میرے دل میں بہت بڑا مضبوط یقین ہے کہ ہماری محنت، ہماری آزادی ہمارے اوپر منحصر ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ اگر ہم محنت کیے جاویں اور اپنی قوتوں کو ٹھیک طور پر استعمال کریں تو اس سے زیادہ ہم کو کوئی موقع یا آئندہ کی قوی توقع اپنی بہتری کے لیے نہیں ہے۔ استقلال اور محنت کامیابی کا بڑا ذریعہ ہے۔ اگر ہم ایک دلی ولولے اور محنت سے کام کیے جائیں گے تو مجھے پورا یقین ہے کہ تھوڑے زمانے میں ہماری حالت بھی ایک عمدہ قوم کی مانند آرام و خوشی و آزادی کی ہو جاوے گی۔''

انسان کی اگلی پشتوں کے حالات پر خیال کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی موجودہ حالت انسانوں کے نسل در نسل کے کاموں

سے حاصل ہوئی ہے۔ محنتی اور مستقل مزاج محنت کرنے والوں، زمین کے جوتنے والوں، کانوں کے کھودنے والوں، نئی نئی باتوں کے ایجاد کرنے والوں، مخفی باتوں کو ڈھونڈ کر نکالنے والوں، آلاتِ جرِثقیل سے کام لینے والوں اور ہر قسم کے پیشہ کرنے والوں، ہنر مندوں، شاعروں، حکیموں، فیلسوفوں، ملکی منتظموں نے انسان کو موجودہ ترقی کی حالت پر پہنچانے میں بڑی مدد دی ہے۔ ایک نسل نے دوسری نسل کی محنت پر عمارت بنائی ہے اور اس کو ایک اعلیٰ درجے پر پہنچایا ہے۔ ان عمدہ کاریگروں سے جو تہذیب و شائستگی کی عمارت کے معمار ہیں، لگا تار ایک دوسرے کے بعد ہونے سے محنت اور علم و ہنر میں جو ایک بے ترتیبی کی حالت میں تھی ایک ترتیب پیدا ہوئی ہے۔ رفتہ رفتہ نیچر کی گردش نے موجودہ نسل کو اس زرخیز اور بے بہا جائیداد کا وارث کیا ہے جو ہمارے بزرگوں کی ہوشیاری اور محنت سے مہیا ہوئی تھی اور وہ جائیداد ہم کو اس لیے نہیں دی گئی ہے کہ ہم صرف مثلِ مارِ سرِ گنج اس کی حفاظت ہی کیا کریں۔ بلکہ ہم کو اس لیے دی گئی ہے کہ اس کو ترقی دیں اور ترقی یافتہ حالت میں آئندہ نسلوں کے لیے چھوڑ جاویں۔ مگر افسوس صد ہزار افسوس کہ ہماری قوم نے ان بزرگوں کی چھوڑی ہوئی جائیداد کو بھی گرا دیا۔

ایک نہایت عاجز و مسکین غریب آدمی جو اپنے ساتھیوں کو محنت اور پرہیز گاری اور بے لگاؤ ایمانداری کی نظیر دکھاتا ہے، اس شخص کا اس کے زمانہ میں اور آئندہ زمانے میں اس کے ملک، اس کی قوم کی بھلائی پر بہت بڑا اثر پیدا ہوتا ہے کیونکہ اس کی زندگی کا طریقہ اور چال چلن گو معلوم نہیں ہوتا مگر اور شخصوں کی زندگی میں خفیہ خفیہ پھیل جاتا ہے اور آئندہ کی نسل کے لیے ایک عمدہ نظیر بن جاتا ہے۔

ہر روز کے تجربے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ شخصی چال چلن میں یہ قوت ہے کہ دوسرے کی زندگی اور برتاؤ اور چال چلن پر نہایت قوی اثر پیدا کرتا ہے اور حقیقت میں یہی ایک نہایت عمدہ عملی تعلیم ہے۔

یہ علم وہ علم ہے، جو انسان کو انسان بناتا ہے۔ اسی علم سے عمل، چال چلن، تعلیم نفسی، نفس کشی، شخصی خوبی، قومی مضبوطی، قومی عزت حاصل ہوتی ہے۔ یہی علم وہ علم ہے کہ جو انسان کو اپنے فرائض ادا کرنے اور دوسروں کے حقوق محفوظ رکھنے اور زندگی کے کاروبار کرنے اور اپنی عاقبت کے سنوارنے کے لائق بنا دیتا ہے۔ اس تعلیم کو آدمی صرف کتابوں سے نہیں سیکھ سکتا اور نہ یہ تعلیم کسی درجے کی علمی تحصیل سے حاصل ہوتی ہے۔ مشاہدہ آدمی کی زندگی کو درست اور اس کے علم کو باعمل، یعنی اس کے برتاؤ میں کر دیتا ہے۔ علم کے بہ نسبت عمل اور سوانح عمری کی بہ نسبت عمدہ چال چلن آدمی کو زیادہ تر معزز اور قابلِ ادب بناتا ہے۔

(مقالاتِ سرسید جلد پنجم)

مشق

1- ''اپنی مدد آپ'' کو مدِ نظر رکھتے ہوئے درج ذیل سوالات کے مختصر جواب تحریر کریں جو تین تین سطور سے زیادہ نہ ہوں۔

i- وہ کون سا آزمودہ مقولہ ہے جس میں انسانوں اور قوموں کا تجربہ جمع ہے؟

ii- سرسید کے خیال میں کون سی قوم ذلیل و بے عزت ہو جاتی ہے؟

iii- نیچر کا قاعدہ کیا ہے؟

-iv قومی ترقی کن خوبیوں کا مجموعہ ہے؟

-v قومی تنزلی کن برائیوں کا مجموعہ ہے؟

-vi بیرونی کوشش سے برائیوں کو ختم کرنے کا کیا نتیجہ نکلتا ہے؟

-vii سر سید کے خیال میں اصلی غلام کون ہے؟

-viii دُنیا کی معزز قوموں نے کس خوبی کی وجہ سے عزت پائی؟

-ix ولیم ڈراگن کے اُصول کا مفہوم بیان کیجیے۔

-x کون سی خوبی آدمی کو معزز اور قابل ادب بناتی ہے؟

-2 ''اپنی مدد آپ'' کے متن کو مدِ نظر رکھتے ہوئے درج ذیل سوالات کے درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگائیں۔

-i ''خدا ان کی مدد کرتا ہے جو آپ اپنی مدد کرتے ہیں'' یہ ایک نہایت عمدہ اور آزمودہ:

(الف) کہاوت ہے (ب) مقولہ ہے

(ج) ضرب المثل ہے (د) محاورہ ہے

-ii ایک شخص میں اپنی مدد کرنے کا جوش اس کی سچی

(الف) تنزلی کی بنیاد ہے۔ (ب) شہرت کی بنیاد ہے۔

(ج) عزت کی بنیاد ہے۔ (د) ترقی کی بنیاد ہے۔

-3 سبق ''اپنی مدد آپ'' کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے درج ذیل جملے مکمل کریں۔

-i خدا ان کی مدد کرتا ہے جو.................. مدد کرتے ہیں۔

-ii جس طرح پانی خود.................. میں آجاتا ہے۔

-iii قوم شخصی.................. کا مجموعہ ہے۔

-iv قوم کی سچی.................. کرو۔

-v ہم لوگوں کے یہ خیال ہیں کہ.................. ملے۔

-4 ''اپنی مدد آپ'' کا مرکزی خیال لکھیں جو دو جملوں سے زیادہ نہ ہو۔

-5 سر سید کے مضمون ''اپنی مدد آپ'' کا خلاصہ لکھیں۔

-6 سیاق و سباق کے حوالے سے درج ذیل اقتباس کی تشریح لکھیے۔

تمام تجربوں سے ثابت ہوا ہے.................. حالتوں کو ترقی نہ کی جاوے۔

مولانا الطاف حسین حالی

(1837ء-1914ء)

سر سید کے اخلاق و خصائل

دوستوں اور مہمانوں سے ان کا دستر خوان بہت کم خالی ہوتا تھا۔ جس دن کوئی مہمان نہ ہوتا وہ کھانا کھاتے وقت بشاش نہ ہوتے تھے اور جس دن زیادہ مہمان ہوتے اس دن ان کے گھر عید ہوتی تھی۔ کھانوں میں زیادہ تر تعدد اور تلوّن نہیں ہوتا تھا مگر کھانا عموماً عمدہ ہوتا تھا۔ اگر کسی موقع پر کھانا عمدہ نہیں ملتا تھا تو جیسا مل جاتا تھا خوشی سے، بغیر ناک منہ چڑھائے سیر ہو کر کھا لیتے تھے۔ فصل کی ترکاریاں اور فواکہ خصوصاً آم اور خربوزے نہایت مرغوب تھے۔ سنا ہے کہ پہلے خوراک زیادہ تھی مگر بڑھاپے میں بہت گھٹ گئی تھی، البتہ بعد کھانا کھانے کے کوئی پاؤ پاؤ سیر دودھ دونوں وقت بلا ناغہ پی لیتے تھے۔

ظرافت اور خوش طبعی ان کی جبلّت میں داخل تھی مگر جس طرح ان کی اور باتوں میں بناوٹ نہ تھی اسی طرح ظرافت اور خوش طبعی میں مطلق تصنع نہ تھا۔ تحریر میں، تقریر میں، بات چیت میں جو لطیفہ یا شوخی ان کو سوجھ جاتی تھی اگرچہ کیسی ہی شرم و حجاب کی بات ہو ان سے ضبط نہ ہو سکتی تھی مگر ہر ایک امر کے بیان کرنے کا خدا نے ایسا سلیقہ دیا تھا کہ کوئی بات تہذیب کی حد سے متجاوز نہ ہونے پاتی تھی۔

مطالعہ کی عادت ابتدا سے ان کی رفیق کار رہی۔ سر سید کا مطالعہ نہ صرف دل بہلانے یا عبارت کا لطف اٹھانے کے لیے ہوتا تھا اور نہ کتاب دانی کی غرض سے جیسا کہ مدرس اور طلبہ کتاب کے ایک ایک لفظ اور جملے اور تراکیب پر غائر نظر کرتے ہیں بلکہ ان کا مطلب صرف مصنف کے خیالات سے اطلاع حاصل کرنا ہوتا تھا۔ جو بات کتاب میں ان کے کام کی ہوتی تھی اس پر پنسل سے نشان کر دیتے تھے اور اگر کوئی مضمون کسی اخبار میں کام کا ہوتا تھا اس ورق کو الگ کر کے اپنے اخبار کی فائل میں جو ہر وقت سامنے رکھا رہتا تھا چسپاں کر دیتے تھے۔

خطوں کا جواب دینے میں وہ نہایت فیاض تھے۔ جو خط پانی پت سے علی گڑھ بھیجا جاتا ہے اگر وہاں پہنچتے ہی اس کا جواب لکھا جائے تو تیسرے دن وہاں سے جواب آ جاتا ہے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میرے خط کا جواب چوتھے دن آیا ہو یا بالکل نہ آیا ہو۔ جب کہ ان کا برتاؤ ہم لوگوں کے ساتھ یہ تھا تو دیکھنا چاہیے کہ اپنے خاص دوستوں اور ہم سروں اور ہم رتبہ لوگوں کے ساتھ کیسا ہوگا۔

محنت اور جفاکشی کی قابلیت بھی سر سید کے خاص اوصاف میں سے تھی۔ قطع نظر اس کے کہ ابتدا سے ان کو کام کرنے کی عادت رہی ان کے قویٰ میں فطرتاً مشکلات کے برداشت کرنے اور کسی کام سے ہمت نہ ہارنے کی لیاقت اور استعداد رکھی گئی تھی اور ظاہراً ان کی غیر معمولی ذہانت بھی ان کے دائمی غور و فکر اور دماغی محنت کا نتیجہ تھی کیونکہ بچپن میں جیسا کہ خود سر سیّد کے بیان سے معلوم ہوا ہے وہ باعتبار ذہانت و جودت کے اپنے ہم چشموں میں کچھ زیادہ امتیاز نہ رکھتے تھے مگر چونکہ اُنھوں نے اپنے تمام قویٰ سے جو خدا تعالیٰ نے ان کے نفس میں ودیعت کیے تھے پورا پورا کام لیا تھا اور اس لیے ان کے ذہن و حافظہ اور عقل سب کو جلا ہو گئی تھی۔

ولایت میں خطبات احمدیہ کے لکھنے میں انھوں نے ڈیڑھ برس برابر ایسی محنتِ شاقہ کی جس سے آخر کار ان کے پاؤں میں ایک مرض پیدا ہوگیا جو اخیر دم تک زائل نہیں ہوا۔ جس زمانے میں سائنٹفیک سوسائٹی کا مکان بنوار ہے تھے سخت گرمی کا موسم تھا۔ شام تک لو چلتی تھی اور کچہری سے آکر خس کی ٹٹی اور پنکھا چھوڑ کر سید ھے سوسائٹی پہنچتے تھے اور عصر اور مغرب کی نمازیں وہیں پڑھتے تھے۔

وہ ہمیشہ جب کام سے خالی ہوتے تھے ہنسی دل لگی اور دوستوں کی صحبت سے اپنے دل کو خوش کرتے تھے۔ بچوں سے، بوڑھوں سے، جوانوں سے، دوستوں سے، ملازموں سے، ہنسی اور چہل کیے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ یہی زندہ دلی تھی جو ان سے سخت محنت کراتی تھی اور تکان اور ماندگی اور ملال وکلال کو کبھی پاس نہ آنے دیتی تھی۔ بعض اوقات ان کے ماتحت یا ملازم جن سے بے تکلفی تھی ان کو ایسا جواب دیتے تھے جس سے انھیں شرمندہ ہونا چاہیے تھا مگر وہ کبھی برا نہ مانتے تھے بلکہ خوب قہقہے لگاتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ غرضیکہ سرسیّد نے تابمقدور کبھی رنج وغم کو پاس نہیں آنے دیا۔ بیرون جات میں، آبادی میں، جنگل میں، جہاں کہیں ہوئے انھوں نے اپنی خوشی اور دل لگی کا کچھ سامان ضرور مہیا کرلیا۔ وہ اپنی باتوں سے نہ صرف بڑوں کو بلکہ بچوں کو بھی تسخیر کر لیتے تھے، یہاں تک کہ جو وحشت بچوں کو بڑے بوڑھوں کی صحبت سے ہوتی تھی وہ ان میں باقی نہ رہی تھی۔

راست بازی اور وہ تمام اوصاف جو ایک راست باز آدمی میں ہونے ضروری ہیں، جیسے صدقِ مؤدت، حمیّت، دلیری اور آزادی وغیرہ اس شخص کی خصوصیات میں سے تھے۔ اس شخص نے اگر سچ پوچھیے تو اپنی آزادانہ تحریروں سے اردو لٹریچر میں آزادی اور سچائی کی بنیاد ڈال دی۔ اس نے لوگوں کو مجبور کیا کہ سچ بات کہنے میں کسی کی طعن وملامت سے نہ ڈریں۔ جو بات اس کو حق معلوم ہوئی، اس کے کہنے میں کبھی اس بات کا خیال نہیں کیا کہ دنیا میں کوئی دوسرا شخص بھی اس بات میں اس کے ساتھ اتفاق کرنے والا ہے یا نہیں۔ سرسیّد کو کوئی بات اس سے زیادہ شاق نہیں گزرتی تھی کہ ان پر راست بازی کے خلاف کوئی الزام لگایا جائے کہ یہ شخص فی الواقع راست بازی کو اپنا دین وایمان سمجھتا تھا۔ سرسیّد جیسے خود راست باز تھے اسی طرح راست بازوں کی دل سے قدر کرتے تھے۔ دوسرے محبت اور التفات کا مادہ سرسید میں معمولی آدمیوں سے بہت زیادہ تھا اور اسی لیے ان کے تمام تعلقات میں محبت کا ظہور بدرجۂ غایت پایا جاتا ہے۔

سرسیّد کو ہمیشہ اپنے کنبے کے ساتھ حد سے زیادہ لگاؤ رہا ہے۔ بھائی کی موت کا صدمہ ان کو بیس برس نہیں بھولا۔ سنا ہے کہ ان کے عزیز ان کے سامنے بھائی کا ذکر اس لیے نہیں کرتے ہیں کہ ان کا داغ تازہ ہوجائے گا۔ بہت مدت کے بعد ان کی بھتیجی کے منہ سے باپ کا کچھ ذکر نکل گیا تھا۔ سرسید کی حالت ایسی متغیر ہوگئی کہ گویا آج ہی بھائی کا انتقال ہوا ہے۔ اپنی والدہ کے ساتھ جیسی ان کو وابستگی تھی ایسی بہت ہی کم سُنی گئی ہے اور جیسی کہ وہ جوانی میں اطاعت وفرمانبرداری کرتے تھے اور ان کے غصے اور خفگی کو برداشت کرتے تھے، اس طرح بچے بھی اپنے ماں باپ کا کہا نہیں مانتے۔

اپنے وطن کے ساتھ ہر شخص کو عموماً الفت وموانست ہوتی ہے۔ مگر سرسیّد کی محبت اپنے وطن کے ساتھ عجیب طرح کی تھی۔ گو بظاہر سرسیّد نے دِلی ہمیشہ کے لیے چھوڑ دی تھی۔ ان کے آرٹیکلوں میں یا اسپیچوں اور لیکچروں میں یا پرائیویٹ خطوں میں جہاں کہیں دلی کا ذکر آگیا ہے ان کا دل اُمڈے بغیر نہیں رہا۔ اگر غور کرکے دیکھا جائے تو سرسیّد کے دل میں قوم کی بھلائی کا خیال اور قومی ہمدردی کا جوش

زیادہ تر دلی ہی کی تباہی اور بربادی نے پیدا کیا۔ سرسیّد جیسے ذکی الحس آدمی کے لیے یہ انقلاب ایک تازیانہ تھا۔ دلی کا سناٹا دیکھ کر ایسی چوٹ ان کے دل پر لگی جو رفتہ رفتہ اور آخر کار ناسور بن گئی۔

جو برتاؤ سرسید کا دوستوں کے ساتھ تھا وہ اس زمانے کے دوستوں سے بہت نرالا تھا۔ جہاں تک ان کا حال دیکھا گیا، ان کی خوشی بلکہ ان کی زندگی کا مدار صرف دو چیزوں پر معلوم ہوتا تھا۔ کام اور دوستوں کی ملاقات سے ان کو شاید ہی کبھی ایسی خوشی ہوتی ہو جیسے اپنے خالص اور مخلص دوستوں سے مل کر ہوتی تھی۔ وہ فی الواقع دوستوں کو زندگی کا ایک عنصر سمجھتے تھے۔

نواب محسن الملک نے ایک موقع پر سرسید کا ذکر خیر کرتے وقت کہا کہ میں نے کسی شخص کی ذات میں اس قدر خوبیاں جمع نہیں دیکھیں۔ میری ان سے پہلی ملاقات ۱۸۶۱ء میں ہوئی تھی۔ اس وقت سے آج تک ایک بات بھی ان میں ایسی نہیں دیکھی جس کو بُرا کہہ سکوں۔ اس شخص کی سچی محبت اور وفاداری دنیا میں کہیں نہیں دیکھی۔ البتہ کتابوں میں بہت کچھ لکھا دیکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ بھائی سے اس قدر ہو سکی ہے اور نہ باپ سے جیسی کہ اس شخص کی محبت خدا نے ڈال دی ہے۔ ان کا قول تھا کہ دوستی کے آگے رشتہ و قرابت کی کچھ حقیقت نہیں۔

اس جبلی مہر و محبت کا مقتضا تھا کہ وہ اپنے رفیقوں اور نوکروں اور لگے بندھوں کو تا بمقدور عمر بھر اپنے ساتھ نباہنا چاہتے تھے۔ جس شخص کے قدم ان کے ہاں جم گئے پھر نہ وہ اس کو اپنے پاس سے جدا کرنا چاہتے تھے اور نہ وہ ان سے جدا ہونا چاہتا تھا۔ اول تو وہ کسی کی شکایت سنتے نہ تھے اور اگر کوئی کسی ملازم کی کوئی شکایت کرتا تھا تو اس کا کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ ان کے ایک قدیم ملازم کی لوگوں نے ان سے بارہا شکایت کی مگر وہ کسی طرح ان کے دل سے نہ اترا۔ ہمیشہ ان کا معتمد علیہ اور سفر و حضر میں ان کے ہمراہ رہا اور آخر انھیں کی رفاقت میں مر گیا۔

سیر چشمی اور فراخ حوصلگی سرسید کے خاص اوصاف میں سے تھے۔ انھوں نے اپنی کمائی سے نہ کبھی مال جمع کرنے کا ارادہ کیا اور نہ اولاد کے لیے کوئی جائیداد خریدی بلکہ جو کچھ کمایا اس کو یا اپنی ضروری آسائش اور سچی عزت اور نیک نامی کے ذرائع میں صرف کیا یا کنبے کی خبر گیری، مستحقوں کی امداد، اولاد کی تعلیم، ملک اور قوم کی بھلائی اور مذہب کی حمایت میں اُٹھایا۔

ابتدا سے ان کا یہ حال رہا کہ جس کام کی لہر ان کے دل میں اُٹھی، اس پر روپیا صرف کرنے میں انھوں نے کبھی پس و پیش نہیں کیا۔ وہ اپنے کھانے، پہننے کے اخراجات میں تنگی کر سکتے تھے اور کرتے تھے مگر اپنے شوق کے کاموں میں انھوں نے کبھی مضائقہ نہیں کیا۔ جس کتاب کی ان کو تلاش ہوئی اگر وہ بیس گنی قیمت پر بھی ملی تو اس کو لیے بغیر نہیں چھوڑا۔

مستحقوں کی امداد و دستگیری کرنے کی بھی ان کی نسبت بے شمار مثالیں سننے میں آئی ہیں۔ سرسیّد کی جوانمردی اور فیاضی صرف اسی میں محدود نہ تھی بلکہ ان کی مثال ایک پھل دار درخت کی سی تھی جو اپنے پھل سے، اپنے سائے سے اور اپنی لکڑی سے غرض کہ ہر طرح سے مخلوق کو فائدہ پہنچاتا ہے۔

غریب پیشہ وروں اور مزدوروں کے ساتھ جو فیاضانہ برتاؤ اس شخص کا تھا اس کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ جب سے وہ مستقل طور

علی گڑھ میں مقیم ہوئے مزدوروں کی مزدوری اور گاڑیوں کا کرایہ پہلے کی نسبت عموماً زیادہ ہوگیا۔ وہ ہمیشہ لوگوں کو ان کی توقع اور حوصلے سے بہت زیادہ دیتے تھے اور جہاں کہیں ان کا رہنا ہوا یہ لوگ ان کے نہایت شکر گزار رہے۔

سرسیّد کے ایک دوست ایک زمانے میں ان کے خانگی اخراجات کا حساب لکھا کرتے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ جب مہینہ ختم ہوا میں تمام اخراجات کا مختصر گوشوارہ بنا کر ان کو دکھانے کے لیے لے گیا۔ سرسیّد نے کہا ''بس مجھے دکھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یونہی چلنے دو۔ میں دیکھوں گا تو ناحق میرے دل کو صدمہ ہوگا''۔ حق یہ ہے کہ جو شخص رات دن اوروں کی اصلاح وفلاح میں رہے گا وہ اپنے خانگی انتظام کی طرف کیونکر متوجہ ہوسکتا ہے۔

مخالفوں اور دشمنوں کی برائیوں کا تحمل کرنا اور کبھی ان سے انتقام لینے کا ارادہ نہ کرنا یہ بھی سرسیّد کے اُن اوصاف میں سے تھا جو ان کی ذات کے ساتھ مخصوص تھے۔ اگرچہ سرسیّد فطرتاً نہایت عالی ظرف اور عالی حوصلہ پیدا ہوئے تھے اور عفو و اغماض ان کی سرشت میں داخل تھا مگر ان کی ابتدائی روک ٹوک اور حسن ترتیب سے یہ تمام ملکات ان کی طبیعت میں اور زیادہ راسخ ہوگئے تھے۔ نیک اور عاقل ماں نے بیٹے کے دل میں یہ بات ڈالی تھی کہ سب سے بہتر تو یہ ہے کہ بروں کی برائی سے بالکل درگزر کی جائے اور اگر بدلہ ہی لینے کا خیال ہو تو اس بڑے اور زبردست انتقام لینے والے کے انصاف پر چھوڑ دینا چاہیے۔ اسی نے لڑکپن میں یہ سبق پڑھایا تھا کہ برائی کرنے والوں کے ساتھ برائی کرنا خود اپنے آپ کو ویسا ہی بنانا ہے۔

سرسیّد کو اس وجہ سے کہ وہ مسلمانوں کی دنیوی ترقی کے لیے کوشش کرتے تھے، امرا سے ملتے تھے، حاکمان وقت سے میل جول رکھتے تھے اور دنیاداروں کی سی زندگی بسر کرتے تھے، کہا جاسکتا تھا کہ وہ دُنیادار ہیں لیکن ان کی حالت پر نظر کرنے سے بہ مشکل ان کو عُرفی معنوں میں دنیادار کہہ سکتے تھے۔

یہ شخص اپنے فرائض کے سوا جن کو وہ اپنے اوپر لازم سمجھتا تھا، درحقیقت کسی چیز سے تعلق نہ رکھتا تھا۔ باوجود وہ قطعی مایوسی کے جو اس کو مسلمانوں کی طرف سے تھی اور جس کو وہ اکثر پرائیویٹ صحبتوں میں نہایت افسوس کے ساتھ ظاہر کرتا تھا اس کی کوششیں آخر دم تک برابر جاری رہیں۔ یہ اسی کی ہمت اور اسی کا حوصلہ تھا جو اس کی ذات پر ختم ہوگیا۔

وہ ان لوگوں میں سے نہ تھا جو لوگوں کو دنیا سے نفرت دلاتے ہیں اور خود مال و دولت جمع کرتے ہیں بلکہ وہ شخص تھا جو ایک امید موہوم پر کہ شاید قوم دنیوی ذلت سے نکلے، اپنا دھن تن من سب قوم پر قربان کرگیا۔

(حیاتِ جاوید)

مشق

1- درست جواب کے شروع میں ✓ کا نشان لگائیں۔

i- ''سر سیّد کے اخلاق و خصائل'' کے مصنف کا نام کیا ہے؟

ا۔ مولانا حالی | ب۔ مولانا شبلی نعمانی
ج۔ خواجہ حسن نظامی | د۔ سیّد عبداللہ

ii- یہ مضمون کس کتاب سے ماخوذ ہے؟

ا۔ ''تاریخ ادب اردو'' سے | ب۔ ''مقالاتِ سر سیّد'' سے
ج۔ ''یادگارِ غالب'' سے | د۔ ''حیاتِ جاوید'' سے

iii- سر سیّد کو کون سا پھل مرغوب تھا؟

ا۔ سیب | ب۔ انگور | ج۔ آم | د۔ انار

iv- سر سیّد کی مرغوب غذا کیا تھی؟

ا۔ کھیر | ب۔ دال | ج۔ گوشت | د۔ جو مل جائے

v- سر سیّد کھانے کے بعد کیا پیتے تھے؟

ا۔ چائے | ب۔ کافی | ج۔ دودھ | د۔ کچھ بھی نہیں

2- مختصر جواب دیں۔

i- کیا سر سیّد خطوں کے جواب باقاعدہ دیتے تھے؟

ii- کیا سر سیّد کو مہمانوں کی آمد ناگوار گزرتی تھی؟

iii- سر سیّد کی شخصیت کا نمایاں ترین پہلو کیا تھا؟

iv- سر سیّد راست بازی کو کیا سمجھتے تھے؟

v- سر سیّد کا دوستوں سے برتاؤ کیسا تھا؟

vi- سر سیّد کو کون سا پھل پسند تھا؟

vii- سر سید کھانے کے بعد عموماً کیا پیتے تھے؟

viii- سر سیّد نے مطالعے کی عادت کب سے اپنائی؟

ix- سر سیّد نے خطباتِ احمدیہ کتنی مدت میں لکھی؟

x- کون سی بات سر سیّد کو سب سے زیادہ ناگوار گزرتی تھی؟

3- متن کو پیشِ نظر رکھ کر خالی جگہ پُر کریں۔

i- سرسیّد کو اپنے کنبے سے حد سے زیادہ............تھا۔

ii- سرسیّد فطرتاً عالی ظرف اور............تھے۔

iii- سرسیّد اپنی باتوں سے بڑوں بلکہ بچوں کو بھی............کر لیتے تھے۔

iv- سرسیّد مذہبی............سے پاک تھے۔

v- سچ بات کہنے میں کسی کی............سے نہ ڈریں۔

4- ''سرسیّد کے اخلاق وخصائل'' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیں۔

5- مندرجہ ذیل اقتباس کی سیاق وسباق کے حوالے سے تشریح کریں۔

دوستوں اور مہمانوں سے ان کا دسترخوان............بلاناغہ پُر لیتے تھے۔

6- مندرجہ ذیل الفاظ وتراکیب کی وضاحت کریں۔

بشاش۔خوش طبعی۔شرم وحجاب۔فیاض۔رنج وغم۔

7- مندرجہ ذیل الفاظ پر اعراب لگا کر ان کا درست تلفظ واضح کریں:۔

خصائل۔جبلت۔ضبط۔فیاض۔متصل۔

8- مندرجہ ذیل الفاظ کی جمع لکھیں۔

خصلت۔لطیفہ۔عادت۔ورق۔تصنیف

9- مندرجہ ذیل الفاظ کے متضاد لکھیں۔

کم۔مہمان۔ابتدا۔جواب۔دائمی۔

حمید عسکری
(1909ء - 1971ء)

ابوالقاسم زہراوی[1]

اندلس کی اسلامی سلطنت کے بعض نامور سائنس دان بلاشبہ اپنے اپنے فن میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے لیکن اس دور کی سب سے عظیم شخصیت، جس کے کمال کا لوہا صدیوں تک اہلِ مغرب مانتے رہے، ابوالقاسم خلف بن عباس زہراوی ہے۔

سپین کے مشہور حکمران عبدالرحمان الناصر نے اپنے دارالسلطنت قرطبہ سے چار میل کے فاصلے پر ایک عظیم الشان محل تعمیر کروایا تھا اور اس کا نام اپنی ملکہ زہرا کے نام پر ''قصرِ زہرا'' رکھا تھا۔ رفتہ رفتہ اس قصر کے گرد اعیانِ سلطنت اور دوسرے لوگوں نے اپنے مکان بنا لیے اور وہاں ایک علیحدہ شہر بس گیا جو ''الزہرا'' کے نام سے موسوم ہوا۔ یہی ذیلی شہر ابوالقاسم خلف بن عباس کا مرز بوم تھا اور اسی شہر کی نسبت سے ''زہراوی'' کا لقب اس کے نام کا جزو بن گیا ہے۔

ابوالقاسم زہراوی کے آباواجداد اندلس ہی کے رہنے والے تھے۔ اس کی ولادت ۹۳۶ء میں عبدالرحمان الناصر ہی کے عہد میں ہوئی جو شاہانِ اندلس میں آٹھواں فرمانروا تھا۔ اس کے عہد میں اندلس کا دارالسلطنت قرطبہ اوج پر پہنچا ہوا تھا۔ چنانچہ اس کی شان و شوکت کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ اس میں تین ہزار آٹھ سو مسجدیں، ساٹھ ہزار سر بفلک عمارتیں، عام لوگوں کے دو لاکھ مکانات، آٹھ ہزار دکانیں اور سات سو حمام تھے۔ قرطبہ کی آبادی دس لاکھ باشندوں پر مشتمل تھی جس میں پچاس سرکاری ہسپتال موجود تھے۔ قرطبہ کی شاہی لائبریری میں دو لاکھ سے زائد کتابیں تھیں۔ قرطبہ یونیورسٹی اس زمانے میں مغرب کی عظیم ترین یونیورسٹی تھی جہاں مختلف مضامین کے جلیل القدر علما تعلیم و تدریس اور تحقیق و تالیف میں مصروف رہتے تھے۔ یہی وہ ماحول تھا جس میں ابوالقاسم زہراوی نے اپنا لڑکپن اور جوانی گزاری۔ اس کے کمالِ فن کو دیکھ کر یہ اندازہ آسانی سے کیا جاسکتا ہے کہ اس نے اس علمی ماحول سے پورا فائدہ اٹھایا اور طب میں، جو اس کا خاص مضمون تھا، کامل دست گاہ حاصل کی۔ اپنی تعلیم کی تکمیل کے بعد وہ قرطبہ کے شاہی شفاخانے کے ساتھ منسلک ہو گیا اور یہاں اس نے اُس عملی تحقیق کا آغاز کیا جس نے تھوڑے ہی عرصے میں اس کو جدید علم الجراحت کا موجد اور اپنے زمانے کا سب سے بڑا سرجن (Surgeon) بنا دیا۔

موجودہ زمانے میں علم علاج کے جو دو طریقے یعنی علاج بالدوا (میڈیسن) اور علاج بالجراحت (سرجری) ہسپتالوں میں مروجہ ہیں، ان کے متعلق یہ خیال عام ہے کہ اگرچہ مغربی طب، یعنی ایلوپیتھی ویسی طب ہی کا چربہ ہے، مگر جراحت، یعنی سرجری خاص مغربی ڈاکٹروں کی چیز ہے جس میں کوئی ان کا ہم سر نہیں ہے۔ لیکن اس خیال کے پھیلنے کی وجہ محض یہ ہے کہ ہمارے عوام اسلامی دور کے عظیم سرجن ابوالقاسم زہراوی کے نام اور اس کے کارناموں سے واقف نہیں، ورنہ یہ حقیقت ہے کہ زہراوی ہی وہ عظیم شخصیت ہے جس نے اہلِ یورپ کو سرجری کے فن سے روشناس کرایا۔

---

[1] ''زہراوی'' عربی زبان کا لفظ ہے۔ اسے ''زہراوی'' بھی لکھتے ہیں۔ لکھنے کے یہ دونوں انداز درست ہیں۔

ابوالقاسم الزہراوی سرجری میں جو نادر آپریشن انجام دیتا تھا، اپنے روز افزوں تجربے سے اس فن میں جو نئی راہیں دریافت کرتا تھا، آپریشن کرنے کے لیے اپنی نگرانی میں جو نئے نئے آلات بنواتا تھا، ان سب کی تفصیل وہ احاطۂ قلم میں لاتا جاتا تھا، یہاں تک کہ اس کے قلم سے عملی سرجری پر ایک یگانۂ روزگار تصنیف ظہور میں آگئی جو صدیوں تک یورپ کی یونیورسٹیوں میں سرجری کی واحد معیاری کتاب کے طور پر داخلِ درس رہی۔

زہراوی کی اس کتاب کا نام ''تصریف'' ہے۔ یہ پوری کتاب تو علم علاج کی دونوں شاخوں طب یعنی میڈیسن اور جراحت یعنی سرجری پر مشتمل ہے، لیکن اس کا سب سے اہم حصہ سرجری کا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے طب یعنی میڈیسن پر تو عربی میں بہت سی کتابیں لکھی جا چکی تھیں لیکن جراحت یعنی سرجری پر اعلیٰ معیار کی پہلی مفصل کتاب ''تصریف'' کا ذکر آتا ہے تو اس سے ''تصریف'' یعنی سرجری کی کتاب ہی مراد ہوتی ہے۔

''تصریف'' تین بڑے حصوں میں منقسم ہے۔ اس کا پہلا حصہ داغ دینے کے متعلق ہے جو ازمنۂ وسطیٰ تک بعض امراض کے علاج میں برتا جاتا تھا۔ ''تصریف'' کے دوسرے اور تیسرے حصے میں عملی جراحت کا بیان ہے اور یہی اس کتاب کے اہم ترین حصے ہیں۔ ان میں دانت نکالنے، آنکھوں کا آپریشن کرنے، حلق کا کوّا کاٹنے، مثانے میں سے پتھری نکالنے، بواسیر کے مسّوں کو کاٹنے، خنازیر کا آپریشن کرنے، ٹوٹی ہڈی کو جوڑنے، اترے ہوئے جوڑوں کو چڑھانے، ماؤف عضو کو کاٹنے اور ہر قسم کے پھوڑوں کو چیرنے کی تفصیلات دی گئی ہیں۔

مختصر یہ کہ جراحت میں ۹۰ فی صد جن اعمال سے ایک سرجن کو سابقہ پڑتا ہے ان میں سے کسی کی تفصیل اس تصنیف میں چھوٹ نہیں گئی۔ ان اعمالِ جراحت کے لیے جن آلات کی ضرورت ہوتی ہے، ان کی تشریح نہایت خوب صورت تصاویر سے کی گئی ہے۔ ان آلات میں قاثاطیر، یعنی پیشاب خارج کرنے کا آلہ، مقامع الاسنان، یعنی دانت نکالنے کا آلہ، محقن یعنی انیما کرنے کا آلہ، مختلف قسم کے نشتر، قینچی، آری، سرجنوں کی سلائی، زخموں کے سینے کے لیے مختلف شکل کی سوئیاں، سبھی شامل ہیں۔ ان میں سے ہر آلے کی ساخت تصویر کی مدد سے اور طریق استعمال الفاظ کے ذریعے سمجھایا گیا ہے۔ ''تصریف'' سے پہلے جراحی پر نہ اتنے پائے کی کوئی کتاب لکھی گئی تھی اور نہ علم جراحت کے متعلق اتنی خوبصورت تصاویر شائع کی گئی تھیں۔

''تصریف'' کی نمایاں خصوصیات میں فاضل مصنف نے اس میں جا بجا اپنے تجربات کی روشنی میں سرجری کے متعلق ایسی تصریحات کی ہیں جن سے طبی دنیا اس سے پہلے بے خبر تھی۔ زہراوی کا طرزِ بیان عام فہم اور زبان سادہ ہے۔ وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتا ہے اس کے تمام رموز اس خوبی سے بیان کرتا ہے کہ قاری کے لیے کسی قسم کا الجھاؤ باقی نہیں رہتا۔ پھر بعض دیگر طبی مصنفوں کی طرح وہ فلسفیانہ موشگافیوں میں نہیں الجھا بلکہ اپنے فن کے عملی پہلوؤں کو سامنے رکھتا ہے اور صرف انھی امور کی توضیح کرنا ضروری خیال کرتا ہے جو عملی افادیت کے حامل ہوں۔

اہلِ مغرب، جو مسلمانوں کے ناموں کو بگاڑنے میں خاص مہارت رکھتے ہیں، ابوالقاسم زہراوی کو ابوالکاسس (Abulcasis)، البوکاسس (Albucasis) اور الزہراویس (Alzaharawius) کے ناموں سے یاد کرتے ہیں۔

یورپ میں ازمنۂ وسطیٰ سے لے کر اٹھارویں صدی تک کے تمام مغربی مصنف، جنھوں نے سرجری پر کتابیں لکھی ہیں، ابوالقاسم زہراوی کی فنی قابلیت کے معترف ہیں اور جابجا اس کی کتاب سے حوالے دیتے ہیں۔ ان میں سے بعض نے تو صاف طور پر اس امر کا اظہار کیا ہے کہ فنِ جراحت میں زہراوی ایک استادِ کامل کی حیثیت رکھتا ہے اور اہلِ یورپ نے ابتدا سرجری میں جو کچھ حاصل کیا ہے وہ صرف زہراوی ہی کی بدولت ہے۔

زہراوی کی کتاب ''تصریف'' صدیوں تک یورپ کی تمام بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں داخلِ درس رہی اور مغرب کے سرجن اس کتاب کے مندرجات کو سند کے طور پر پیش کرتے رہے۔

''تصریف'' کا لاطینی ترجمہ سب سے پہلے وینس سے ۱۴۹۷ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد اس کا لاطینی ایڈیشن، جس میں عربی کتاب کی اصل تصویریں بھی نہایت آب و تاب سے چھاپی گئی تھیں، ۱۵۴۱ء میں باسل میں طبع ہوا۔ باسل ایڈیشن کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس میں اصل عربی کتاب اور اس کا لاطینی ترجمہ دونوں ایک ہی جلد میں شامل تھے۔ یورپ میں اس کتاب کی مقبولیت انیسویں صدی کے آخر تک بھی باقی تھی۔ چنانچہ ایک فرانسیسی ڈاکٹر لی کارک نے ۱۸۸۱ء میں ''التصریف'' کو فرانسیسی زبان میں منتقل کیا اور دیباچے میں اس کتاب کو سرجری کا ایک نادر شاہکار قرار دیا۔ یورپ کے فضلانے ''التصریف'' کو محض اپنی زبانوں میں منتقل کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان میں سے بعض نے اس کتاب پر شرحیں بھی لکھی تھیں۔

(نامور مسلم سائنس دان)

مشق

1- مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات میں سے جو درست ہیں، ان کے شروع میں (✓) کا نشان لگائیں:

i- عبدالرحمان الناصر کس ملک کا حکمران تھا؟

ا۔ اردن کا	ب۔ مصر کا
ج۔ سپین کا	د۔ سوڈان کا

ii- ابوالقاسم زہراوی کون تھا؟

ا۔ ماہرِ تعمیرات	ب۔ سائنس دان
ج۔ ماہرِ تعلیم	د۔ ماہرِ قانون

iii- ابوالقاسم زہراوی کے آباو اجداد کہاں کے رہنے والے تھے؟

ا۔ مصر	ب۔ ایران
ج۔ عراق	د۔ اندلس

iv- قرطبہ کی شاہی لائبریری میں کتنی کتابیں تھیں؟

ا۔ ایک لاکھ	ب۔ ایک لاکھ سے زائد
ج۔ دو لاکھ سے زائد	د۔ تین لاکھ سے زائد

v- ابوالقاسم زہراوی نے اہلِ یورپ کو کس فن سے روشناس کرایا؟

ا۔ فنِ تعمیرات سے	ب۔ فنِ دوا سازی سے
ج۔ سرجری کے فن سے	د۔ فنِ کیمیا گری سے

2- مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں:

i- ابوالقاسم زہراوی کی مشہور تصنیف کا نام کیا ہے؟

ii- ڈاکٹر لی کارک نے اس کتاب کا کس زبان میں ترجمہ کیا؟

iii- زہراوی کس یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم رہے؟

iv- زہراوی کی مشہور تصنیف کن یونیورسٹیوں میں داخلِ درس رہی؟

v- زہراوی کے عہد میں مغرب کی عظیم ترین یونیورسٹی کون سی تھی؟

3- مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کا مفہوم لکھیں:

مہارتِ تامہ، جلیل القدر، چربہ، نادر، عملِ جراحت۔

4- مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کو اس طرح سے جملوں میں استعمال کریں کہ ان کی تذکیر و تانیث واضح ہو جائے:

تحقیق، علم الجراحت، امراض، ساخت، اکتفا۔

پریم چند
(1880ء-1936ء)

ادیب کی عزّت

صبح کے وقت حضرت قمر نے بیس دفعہ اُبالی ہوئی چائے کا پیالا تیار کیا اور بغیر چینی اور دودھ کے پی گئے۔ یہی ان کا ناشتا تھا۔ دودھ اور چینی ان کے نزدیک ضروریاتِ زندگی میں نہ تھیں۔ گھر میں گئے ضرور، کہ بیوی کو جگا کر پیسے مانگیں، پر اُسے پھٹے میلے لحاف میں سوتے دیکھ کر جگانے کو جی نہ چاہا۔ سوچا شاید مارے سردی کے رات بھر نیند نہ آئی ہوگی، اس وقت جا کر آنکھ لگی ہے۔ کچی نیند جگا دینا مناسب نہ تھا۔ چپکے سے لَوٹ گئے۔

چائے پی کر انھوں نے قلم دوات سنبھالی اور وہ کتاب لکھنے میں محو ہو گئے۔ جو ان کے خیال میں اس صدی کی بہترین تصنیف ہوگی جس کی اشاعت ان کو قعرِ گمنامی سے نکال کر شہرت اور ناموری کے آسمان پر پہنچادے گی۔ آدھ گھنٹا کے بعد بیوی آنکھیں ملتے ہوئے آ کر بولی:

''چائے پی چکے؟''

قمر نے خوش ہو کر جواب دیا۔ ''ہاں پی چکا، بہت اچھی بنی تھی۔''

''مگر دودھ اور چینی کہاں سے لائے؟''

''آج کل سادہ چائے اچھی معلوم ہوتی ہے۔ دودھ اور چینی ملانے سے چائے کا ذائقہ بگڑ جاتا ہے۔ ڈاکٹروں کی بھی یہی رائے ہے۔ یورپ میں تو دودھ کا بالکل رواج نہیں۔ یہ تو ہمارے ہاں کے رئیسوں کی ایجاد ہے۔''

''نہ جانے آپ کو پھیکی چائے کیونکر اچھی معلوم ہوتی ہے۔ مجھے جگا کیوں نہ لیا؟ پیسے رکھے تھے۔'' قمر نے جواب نہ دیا اور پھر لکھنے لگے۔ جوانی ہی میں انھیں یہ بیماری لگ گئی تھی اور آج بیس سال سے وہ اسے پالے ہوئے تھے۔ اس بے نیازی کی شان سے جو ادیبوں کی امتیازی صفت ہے، انھوں نے کسبِ معاش کے کسی اور ذریعہ کی طرف توجہ نہ کی۔ اس بیماری میں جسم گُھل گیا۔ صحت گُھل گئی اور چالیس سال کی عمر ہی میں بڑھاپے نے آ کر گھیر لیا مگر یہ مرض لاعلاج ہے۔ طلوعِ آفتاب سے آدھی رات تک یہ ادب کا پجاری دنیا و مافیہا سے بے خبر فکرِ سخن میں غرق رہتا۔ اب انھیں یہ شبہ ہونے لگا تھا کہ میرے مضامین میں کوئی خوبی کوئی معنی ہی نہیں، اور یہ انکشاف بدرجہ غایت ہمت شکن تھا۔ یہ عمرِ عزیز یوں تلف ہوگئی۔ یہ تسکین بھی نہیں کہ دنیا نے ناقدری کی ہو مگر ان کا کارنامۂ حیات حقیر نہیں۔ ضروریاتِ زندگی گھٹتے گھٹتے زہد کی حدود کو بھی پار کر چکی تھیں۔ اگر کوئی تسکین تھی تو محض یہ کہ ان کی رفیقۂ حیات ترک و ایثار میں ان سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔ سکینہ اس تباہ حالی میں بھی مطمئن تھی۔ قمر کو دنیا سے شکایت ہو مگر سکینہ ہمیشہ اس کی دلجوئی کرتی رہتی تھی۔ اپنے نصیبوں کو رونا تو دور کی بات تھی اس نے کبھی ماتھے پر بل بھی نہ آنے دیا۔ سکینہ نے چائے کا پیالہ سمیٹتے ہوئے کہا:

''تو جا کر گھنٹا آدھ گھنٹا کہیں گھوم پھر کیوں نہیں آتے۔ جب معلوم ہو گیا کہ جان دے کر کام کرنے سے بھی کوئی نتیجہ نہیں تو بیکار کیوں سر کھپاتے ہو؟''

قمر نے بغیر قلم اٹھائے ہوئے کہا! '' لکھنے میں کم از کم یہ تسلی تو ہوتی ہے کہ کچھ کر رہا ہوں۔ سیر کرنے میں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقت ضائع ہو رہا ہے۔''

''یہ اتنے لکھے پڑھے آدمی ہر روز ہوا کھانے جاتے ہیں تو یہ کیا اپنا وقت ضائع کرتے ہیں؟''

''مگر ان میں زیادہ تر وہی لوگ ہوتے ہیں جن کو سیر کرنے سے مالی نقصان نہیں ہوتا۔ اکثر تو سرکاری ملازم ہوتے ہیں جن کو ماہوار تنخواہ مل جاتی ہے یا ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کی عوام میں عزت ہے، میں تو مل کا مزدور ہوں۔ تم نے کبھی مزدوروں کو بھی ہوا کھاتے دیکھا ہے؟ جنھیں کھانے کی کمی نہیں ان کو ہوا کی ضرورت ہے۔ جنھیں روٹیوں کے لالے ہیں وہ ہوا کیا کھائیں گے؟ پھر تندرستی اور لمبی عمر کی بھی ان ہی کو ضرورت ہے۔ اس بار کو سر پر کچھ دن اور اٹھائے رکھنے کی خواہش مجھے کیا ضرور ہے۔''

سکینہ نے مایوسی میں ڈوبی ہوئی باتیں سنیں تو آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اندر چلی گئی۔ اس کا دل کہتا تھا، اس تپ کا پھل ایک دن انھیں ضرور ملے گا۔ دولت حاصل ہو نہ ہو لیکن قمر صاحب یاس کی حد تک جا پہنچے تھے، جہاں سے سمتِ مخالف میں طلوع ہونے والی امید کی سرخی بھی نہیں دکھائی دیتی۔

(۲)

ایک رئیس کے یہاں کوئی تقریب ہے۔ اس نے حضرت قمر کو بھی مدعو کیا ہے۔ آج ان کا دل خوشی کے گھوڑے پر بیٹھا ہوا ناچ رہا ہے۔ سارے دن وہ اسی تخیل میں محو رہے۔ راجا صاحب کن الفاظ میں ان کا خیر مقدم کریں گے اور وہ کن الفاظ میں ان کا جواب دیں گے۔ کن مضامین پر گفتگو ہوگی اور کن کن اصحاب سے ان کا تعارف کرایا جائے گا۔ سارا دن وہ انھی خیالات کے لطف اٹھاتے رہے۔ اس موقع کے لیے انھوں نے ایک نظم بھی تیار کی جس میں انھوں نے زندگی کو ایک باغ سے تشبیہ دی تھی۔ سرابِ ہستی ان کے زورِ طبع کے لیے زیادہ موزوں چیز تھی مگر وہ آج رئیسوں کے جذبات کو ٹھیس نہ لگا سکتے تھے۔

دوپہر ہی سے انھوں نے تیاریاں شروع کیں۔ حجامت بنائی۔ صابن سے نہائے۔ سر میں تیل ڈالا، وقت کپڑوں کی تھی۔ مدت گزری، جب انھوں نے ایک اچکن بنوائی تھی۔ اس کی حالت بھی ان کی سی تھی جیسے ذرا سی سردی یا گرمی سے انھیں زکام یا سر درد ہو جاتا تھا اسی طرح وہ اچکن بھی نازک مزاج تھی۔ اسے نکالا اور جھاڑ پونچھ کر رکھا۔

سکینہ نے کہا'' تم نے ناحق وہاں جانا منظور کیا، لکھ دیتے میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ ان پھٹے حالوں جانا تو اور بھی بُرا ہے۔''

قمر نے فلاسفروں کی سی سنجیدگی سے کہا'' جنھیں خدا نے دل اور سمجھ دی ہے وہ آدمیوں کا لباس نہیں دیکھتے، ان کے منہ دیکھتے ہیں۔ آخر کچھ بات تو ہے کہ راجا صاحب نے مدعو کیا ہے۔ میں کوئی عہدے دار نہیں، زمیندار نہیں، جاگیردار نہیں، ٹھیکہ دار نہیں، معمولی ایک شاعر ہوں۔ شاعر کی قیمت اس کی نظمیں ہوتی ہیں۔ اس نقطۂ نگاہ سے مجھے کسی کے سامنے نادم ہونے کی ضرورت نہیں۔''

سکینہ ان کی سادگی پر ترس کھا کر بولی ''تم خیالات کی دنیا میں رہتے رہتے حقیقی دنیا سے بالکل بے گانہ ہو گئے ہو۔ میں کہتی ہوں راجا صاحب کے یہاں لوگوں کی نگاہ سب سے زیادہ کپڑوں ہی پر پڑے گی۔ سادگی ضرور اچھی چیز ہے لیکن اس کے معنی یہ تو نہیں کہ آدمی بیوقوف ہی بن جائے۔''

قمر کو اس دلیل میں کچھ جان نظر آئی۔ اہلِ نظر کی طرح انھیں اپنی غلطیوں کے اعتراف میں پس وپیش نہ ہوتا تھا۔ بولے:

''میرا خیال ہے چراغ جل جانے کے بعد جاؤں۔''

''میں تو کہتی ہوں جاؤ ہی کیوں؟''

''اب تم کو کیسے سمجھاؤں۔ ہر شخص کے دل میں اعزاز و احترام کی بھوک ہوتی ہے۔ تم پوچھوگی یہ بھوک کیوں ہوتی ہے؟ اس لیے کہ یہ ہماری روح کے ارتقا کی ایک منزل ہے۔ ہم اس عظیم الشان طاقت کا لطیف حصہ ہیں جو ساری دنیا میں حاضر و ناظر ہے۔ جزو میں کل کی خوبیاں ہونا لازمی امر ہے۔ اس لیے جاہ و رفعت علم و فضل کی جانب ہمارا فطری میلان ہے۔ میں اس ہوس کو معیوب نہیں سمجھتا۔ ہاں! چونکہ دل میں ضعف ہے۔ اہلِ دنیا کی حرف گیریوں کا خیال قدم قدم پر دامن گیر ہو جاتا ہے۔''

سکینہ نے گلا چھڑانے کے لیے کہا ''اچھا بھئی جاؤ۔ میں تم سے بحث نہیں کرتی لیکن کل کے لیے کوئی سبیل سوچتے جاؤ کیونکہ میرے پاس صرف ایک آنہ اور رہ گیا ہے۔ جن سے قرض مل سکتا تھا ان سے لے چکی اور جس سے لیا اُسے دینے کی نوبت نہیں آئی۔ مجھے تو اب اور کوئی صورت نظر نہیں آتی۔''

قمر نے ایک لمحہ کے بعد کہا ''دو ایک اخباروں سے روپیا آنے والا ہے۔ شاید کل تک آجائے اور اگر فاقہ کشی ہی کرنی پڑے تو کیا فکر ہے۔ ہمارا فرض کام کرنا ہے۔ ہم کام کرتے ہیں اور دل و جان سے کرتے ہیں۔ اگر اس کے باوجود فاقہ کرنا پڑے، تو میرا قصور نہیں۔ مر ہی تو جاؤں گا۔ ہمارے جیسے لاکھوں آدمی آئے دن مرتے رہتے ہیں۔ دنیا کا کوئی کام بند نہیں ہوتا۔ تم ہی کہو میں جو کچھ کرتا ہوں، اس سے زیادہ میرے امکان میں کیا ہے؟ ساری دنیا میٹھی نیند سوتی ہے اور میں قلم لیے بیٹھا رہتا ہوں۔ لوگ سیر و تفریح کرتے ہیں، کھیلتے کودتے ہیں۔ میرے لیے سب کچھ حرام ہے۔ یہاں تک کہ مہینوں سے ہنسنے کی نوبت نہیں آئی۔ عید کے دن بھی میں نے تعطیل نہیں منائی۔ بیمار ہوتا ہوں، جب بھی لکھتا ہوں۔ سو چو تم بیمار تھیں اور میرے پاس حکیم کے پاس جانے کے لیے بھی وقت نہ تھا۔ اگر دنیا نہیں قدر کرتی نہ کرے۔ اس میں دنیا ہی کا نقصان ہے میرا تو کوئی نقصان نہیں۔ چراغ کا کام جلنا ہے۔ اس کی روشنی پھیلتی ہے یا اس کے سامنے کوئی دیوار ہے، اسے اس سے مطلب نہیں۔ میرا بھی ایسا کون دوست، شناسا یا رشتہ دار ہے جس کا میں شرمندۂ احسان نہیں۔ یہاں تک کہ اب گھر سے نکلتے بھی شرم آتی ہے۔ اطمینان صرف اتنا ہے کہ لوگ مجھے بدنیت تصور نہیں کرتے۔ خواہ وہ میری کچھ زیادہ امداد نہ کر سکیں مگر انھیں مجھ سے ہمدردی ہے۔ میری خوشی کے لیے اسی قدر کافی ہے کہ آج مجھے ایک رئیس نے بلایا ہے۔''

پھر معاً ان پر نشہ سا چھا گیا۔ غرور سے بولے:

''نہیں اب رات کو نہ جاؤں گا۔ جسے راجا لوگ مدعو کریں، وہ ایسا ویسا آدمی نہیں ہو سکتا۔ راجا صاحب معمولی رئیس نہیں۔

اگراب بھی کوئی مجھے معمولی آدمی سمجھے، تو اس کی عقل کا فتور ہے۔''

(۳)

شام کے وقت حضرت قمر اپنی پھٹی پُرانی اچکن، سڑے ہوئے جوتے اور بے تکی سی ٹوپی پہنے گھر سے نکلے تو گنوار اُچکّے سے معلوم ہوتے تھے۔ ڈیل ڈول اور چہرے مہرے کے آدمی ہوتے تو اس ٹھاٹھ میں بھی ایک شان ہوتی۔ فربہی بجائے خود بارُعب شے ہے مگر ادبی خدمت اور فربہی میں خدا واسطے کا بیر ہے۔ اگر کوئی ادیب موٹا تازہ ہے تو سمجھ لیجیے کہ اس میں سوز نہیں، لوچ نہیں، دل نہیں۔ پھر بھی اکڑے جاتے تھے۔ ایک ایک عضو سے غرور ٹپکتا تھا۔

یوں گھر سے نکل کر وہ دکان داروں سے آنکھ بچا کر نکل جاتے تھے مگر آج وہ گردن اٹھائے ان کے سامنے سے جا رہے تھے۔ آج وہ ان کے تقاضوں کا دنداں شکن جواب دینے کو تیار تھے مگر شام کا وقت تھا ہر ایک دکان پر خریداروں کا ہجوم تھا۔ کوئی ان کی طرف نہیں دیکھتا۔ جس رقم کو وہ بہت زیادہ سمجھتے تھے، وہ دکان داروں کی نگاہوں میں معمولی تھی۔ کم از کم ایسی نہ تھی جس کی خاطر وہ کسی کی عزت اُتار کر رکھ دیں۔ حضرت قمر نے ایک مرتبہ سارے بازار کا چکر لگایا، پر جی نہ بھرا۔ تب دوسرا چکر لگایا اس سے بھی کچھ نہ بنا۔ تب وہ خود حافظ صمد کی دکان پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ حافظ صاحب بساطی کا کام کرتے تھے۔ قمر کو دیکھ کر بولے ''واہ حضرت! ابھی تک چھاتے کے دام نہیں ملے۔ ایسے سو پچاس گاہک مل جائیں تو دیوالہ نکل جائے۔ اب تو دن بہت ہو گئے۔''

حضرت قمر کی باچھیں کھل گئیں۔ دل کی مراد پوری ہوئی۔ بولے ''میں بھولا نہیں ہوں حافظ صاحب، ان دنوں کام کی اس قدر زیادتی رہی کہ گھر سے نکلنا دشوار تھا۔ روپیا تو ہاتھ نہیں آتا پر آپ کی دُعا سے قدر شناسوں کی کمی نہیں۔ دو چار آدمی گھیرے ہی رہتے ہیں۔ زندگی وبال ہے۔ اس وقت بھی راجا صاحب .... اجی وہی جونکڑ والے بنگلے میں رہتے ہیں ان ہی کے یہاں جا رہا ہوں، روز کوئی نہ کوئی ایسا ہی موقع آتا رہتا ہے۔''

حافظ صاحب مرعوب ہو گئے .... ''اچھا آپ راجا صاحب کے ہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟ ٹھیک ہے۔ آپ جیسے باکمالوں کی قدر رئیس ہی کر سکتے ہیں اور کون کرے گا۔ اگر کوئی موقع ہاتھ آئے تو غریب کو بھول نہ جایئے گا۔ راجا صاحب کی اگر ادھر نگاہ ہو جائے تو پھر کیا پوچھنا، ایک پورا بساط خانہ تو ان ہی کے لیے درکار ہے۔ ڈھائی تین لاکھ سالانہ کی آمدنی ہے۔''

قمر صاحب کو ڈھائی تین لاکھ کی آمدنی حقیر سی معلوم ہوئی۔ زبانی جمع خرچ ہے تو بیس لاکھ کہنے میں کیا حرج ہے؟ بولے ''ان کی آمدنی دس لاکھ سے کم نہیں۔ ایک صاحب کا اندازہ تو بیس لاکھ کا ہے۔ مکان ہے، دکانیں ہیں، ٹھیکہ ہے، امانتی روپے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سرکار بہادر کی نگاہ ہے۔''

حافظ نے بڑے عجز سے کہا ''یہ دکان آپ کی ہے۔ جناب بس اتنی ہی عرض ہے۔ اے مرادی، ذرا دو پیسے کے اچھے پان تو بنوا لا۔ آپ کے لیے۔ آیئے دو منٹ بیٹھیے، کوئی چیز دکھاؤں گا۔ آپ سے تو گھر کا معاملہ ہے۔''

قمر نے پان کھاتے ہوئے کہا ''اس وقت تو معاف رکھیے۔ وہاں دیر ہوگی، پھر کبھی حاضر ہوں گا۔''

یہاں سے اٹھ کر وہ ایک کپڑے والے کی دکان پر رُکے۔ انھیں دیکھ کر آنکھیں اٹھائیں ۔ بے چارہ ان کے نام کو رو بیٹھا تھا۔ سوچتا تھا شاید کہیں چلے گئے۔ سمجھا روپے دینے آئے ہیں۔ بولا:

''بھائی، آپ نے تو بہت دن سے درشن ہی نہیں دیے۔ کئی بار رقعہ بھیجا، مگر آدمی کو آپ کے مکان کا پتا نہ تھا۔ منشی جی ذرا دیکھو تو آپ کے نام کیا نکلتا ہے؟''

قمر کی روح تقاضوں سے کانپتی تھی، لیکن آج اس طرح بے فکر کھڑے تھے جیسے کوئی آہنی خود پہن لیا ہو۔ جس پر کوئی ہتھیار کارگر نہیں ہوتا۔ بولے'' ذرا راجا صاحب کے یہاں ہو آؤں تو بے فکر ہو کر بیٹھوں۔ اس وقت نہیں جلدی میں ہوں۔''

راجا صاحب پر کئی سو روپے نکلتے تھے۔ پھر بھی ان کا دامن نہ چھوڑتا تھا۔ ایک کے تین وصول کرتا۔ اس نے قمر کو بھی اس جماعت میں رکھ لیا جس کا پیشہ رئیسوں کو لوٹنا ہے۔ بولا:

''پان تو کھاتے جایئے جناب! راجا صاحب ایک دن کے ہیں، ہم تو بارہ مہینوں کے ہیں۔ کچھ کپڑا درکار ہو تو لے جایئے، عید آ رہی ہے۔ موقع ملے تو راجا صاحب کے خزانچی سے کہنا'' پرانا حساب بہت دنوں سے پڑا ہے، اب تو صاف ہو جائے۔ اب ہم ایسا کون سا نفع لے لیتے ہیں کہ دو دو سال تک حساب ہی نہ ہو۔''

قمر بولے'' اس وقت پان وان رہنے دو بھائی۔ دیر ہو جائے گی۔ جب انھیں مجھ سے ملنے کا اس قدر اشتیاق ہے اور میرا اتنا ادب کرتے ہیں تو میرا بھی فرض ہے کہ انھیں تکلیف نہ ہونے دوں۔ ہم تو قدردانی چاہتے ہیں، دولت کے بھوکے نہیں۔ کوئی ہمیں چاہے تو ہم اس کے غلام ہیں۔ کسی کو ریاست کا غرور ہے تو ہمیں بھی اپنے علم و کمال کا غرور ہے۔''

(۴)

حضرت قمر راجا صاحب کے بنگلے کے سامنے پہنچے تو دیے جل چکے تھے۔ امیروں اور رئیسوں کی موٹریں کھڑی تھیں۔ دروازے پر وردی پوش دربان کھڑے تھے۔ ایک صاحب مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے۔ قمر کو دیکھ کر وہ جھجکے، پھر انھیں سر سے پاؤں تک دیکھ کر بولے'' آپ کے پاس کارڈ ہے؟''

قمر صاحب کی جیب میں کارڈ تھا، مگر اس مطالبے پر انھیں غصہ آ گیا۔ انھی سے کیوں کارڈ مانگا گیا؟ اوروں سے تو کوئی پوچھتا نہیں۔ بولے:

''میرے پاس تو کوئی کارڈ نہیں، اگر آپ دوسروں سے کارڈ مانگتے تو میں بھی دکھا دیتا۔ ورنہ میں اسے اپنی توہین سمجھتا ہوں۔ آپ راجا صاحب سے کہہ دیجیے گا، قمر آیا تھا، لوٹ گیا۔''

وہ بولے'' نہیں نہیں جناب، اندر چلیے، آپ سے تعارف نہ تھا۔ معاف فرمایئے۔ آپ ہی جیسے اصحاب سے تو محفل کی رونق ہے۔ خدا نے آپ کو وہ کمال عطا فرمایا ہے کہ سبحان اللّٰہ۔''

اس شخص نے قمر کو کبھی نہ دیکھا تھا مگر اس نے جو کچھ کہا وہ ہر ایک مصنف، ہر ایک شاعر کے متعلق کہا جا سکتا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ

کوئی ادیب اس داد سے مستثنیٰ نہیں۔

قمر اندر پہنچے تو دیکھا کہ بارہ دری کے سامنے وسیع اور آراستہ احاطے میں بجلی کے لیمپ روشن ہیں۔ وسط میں ایک حوض ہے اور حوض میں سنگ مرمر کی ایک پری۔ پری کے سر پر فوارہ۔ فوارے کی پھواریں رنگین لیمپوں سے رنگین ہو کر ایسی معلوم ہوتی تھیں، جیسے قوسِ قزح پگھل کر برس رہا ہو۔ حوض کے چاروں طرف میزیں لگی تھیں۔ میزوں پر سفید پوش، ان پر خوب صورت گلدستے ....۔

قمر کو دیکھتے ہی راجا صاحب نے خیر مقدم کیا "آیئے آیئے، اب کے آپ کی نظم دیکھ کر تو دل خوش ہو گیا۔ مجھے معلوم نہ تھا، اس شہر میں آپ جیسے رتن بھی چھپے ہوئے ہیں۔"

پھر بیٹھے ہوئے احباب سے ان کا تعارف کرانے لگے "آپ نے حضرت قمر کا نام تو سنا ہوگا؟ وہ آپ ہی ہیں۔ کیا شیرینی ہے، کیا جدت ہے، کیا تخیل ہے، کیا روانی ہے، کیا ندرت ہے کہ واہ! میرا دل تو آپ کی چیزیں پڑھ کر ناچنے لگتا ہے۔"

ایک صاحب نے جو انگریزی سوٹ میں تھے، قمر کو ایسی نگاہوں سے دیکھا گویا وہ چڑیا گھر کا کوئی جانور ہو اور بولے "آپ نے انگریزی شاعری کا بھی مطالعہ کیا۔ بائرن، شیلے، ٹینی سن وغیرہ؟"

قمر نے بے اعتنائی سے جواب دیا "جی ہاں تھوڑا بہت دیکھا ہے۔"

"آپ ان استادانِ فن کی کتابوں میں سے کسی کا ترجمہ کر دیں تو آپ اپنی زبان کی بڑی خدمت کریں۔"

قمر اپنے آپ کو بائرن، شیلے سے جو بھر کم نہ سمجھتے تھے۔ بولے "ہمارے یہاں روحانیت کا ابھی اتنا فقدان نہیں ہوا کہ مغربی شاعروں سے بھیک مانگیں۔ میرا خیال ہے کم از کم اس مضمون میں ہم اب بھی مغرب کو بہت کچھ سکھا سکتے ہیں۔"

انگریزی پوش صاحب نے قمر کو پاگل سمجھا۔ راجا صاحب نے قمر کو ایسی نگاہوں سے دیکھا گویا کہہ رہے ہوں ذرا موقع و محل دیکھ کر باتیں کرو اور بولے "انگریزی لٹریچر کا کیا کہنا۔ شاعری میں تو اس کا جواب نہیں ہے۔"

انگریزی پوش "ہمارے شاعروں کو ابھی تک اتنا بھی معلوم نہیں کہ شاعری کے کیا معنی ہیں وہ ابھی تک ہجر و وصال کو شاعری کا منتہائے مقصود سمجھے بیٹھے ہیں۔"

قمر نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا "میرا خیال ہے آپ نے ہندوستانی شعرا کا کلام ابھی تک دیکھا ہی نہیں اور اگر دیکھا ہے تو سمجھا نہیں۔"

راجا صاحب نے قمر کا منہ بند کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ بولے "آپ کے مضامین انگریزی اخبارات میں چھپتے ہیں اور لوگ انھیں بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔"

اس کے معنے یہ ہیں کہ اب آپ زیادہ نہ بہکیے۔ ایک اور صاحب آئے۔ راجا صاحب نے تپاک سے ان کا بھی استقبال کیا۔ "آیئے ڈاکٹر، مزاج تو اچھے ہیں؟"

راجا صاحب نے قمر کا تعاف کرایا ''آپ حضرت قمر شاعر ہیں۔''

ڈاکٹر صاحب نے خاص انداز سے کہا ''اچھا! آپ شاعر ہیں۔'' اور بغیر کچھ کہے سنے آگے بڑھ گئے۔

یہ تماشا کئی مرتبہ ہوا اور ہر بار قمر کو یہی داد ملی ''اچھا آپ شاعر ہیں۔''

یہ الفاظ ہر مرتبہ قمر کے دل پر نیا صدمہ پہنچاتے تھے۔ ان کا باطنی مفہوم قمر سے چھپا نہ تھا۔ عام فہم الفاظ میں یہ مطلب تھا ''تم اپنے خیالی پلاؤ پکاتے ہو پکاؤ۔ یہاں تمھارا کیا کام؟ تمھارا اتنا حوصلہ کہ اس محفل میں چلے آؤ؟''

قمر اپنے اوپر جھنجھلا رہے تھے۔ دعوتی کارڈ پا کر وہ پھولے نہ سمائے تھے لیکن یہاں آ کر ان کی جس قدر تذلیل ہوئی اس کو دیکھ کر اپنا اطمینان کا جھونپڑا جنت سے کم نہ تھا۔ انھوں نے اپنے آپ کو طعن کی۔ ''تمھارے جیسے عزت کے ہوس مندوں کی یہی سزا ہے۔ اب تو آنکھیں کھلیں کہ تم کتنی عزت کے مستحق ہو۔ تم خود اس غرض مند دنیا میں کسی کے کام نہیں آسکتے۔ وکیل تمھارا احترام کیوں کریں؟ تم ان کے مؤکل نہیں ہو سکتے۔ ڈاکٹر اور حکیم تمھاری طرف کیوں دیکھیں؟ انھیں بغیر فیس کے گھر آنے کی ضرورت نہیں۔ تم لکھنے کے لیے بنے ہو۔ لکھتے جاؤ۔ اس دنیا میں تمھارا اور کوئی مصرف نہیں۔''

یکا یک لوگوں میں ہل چل مچ گئی۔ آج کا جلسہ جن صاحب کے اعزاز میں تھا وہ یورپ سے کوئی بڑی ڈگری لے کر آئے تھے۔

راجا صاحب نے لپک کر ان سے ہاتھ ملایا اور قمر سے بولے ''آپ اپنی نظم تو لائے ہوں گے؟''

قمر نے جواب دیا ''میں نے کوئی نظم تیار نہیں کی۔''

''سچ اب تو آپ نے غضب ہی کر ڈالا۔ ارے بھلے آدمی تو اب ہی بیٹھ کر کوئی چیز لکھ لو، دو چار شعر ہی ہو جائیں۔ ایسے موقع پر نظم کا پڑھا جانا لازمی ہے۔''

''میں اس قدر جلد کوئی چیز نہیں لکھ سکتا۔''

''میں نے بیکار اتنے آدمیوں سے آپ کا تعارف کرایا۔''

''بالکل بیکار۔''

''ارے بھائی جان، کسی پرانے شاعر ہی کی کوئی چیز سنا دیجیے۔ یہاں کون جانتا ہے۔'' ''جی نہیں، معاف فرمایئے۔ میں بھاٹ یا میراثی نہیں ہوں۔'' یہ کہتے کہتے حضرت قمر وہاں سے چل دیے۔

گھر پہنچے تو ان کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ سکینہ نے خوش ہو کر پوچھا۔

''اتنی جلدی کیونکر چلے آئے؟''

''میری وہاں ضرورت نہ تھی۔''

''چہرہ کھلا ہوا ہے، خوب عزت افزائی ہوئی ہوگی؟''

''ایسی کہ خواب میں بھی امید نہ تھی۔''

''خوب خوش ہو رہے ہو؟''

''اس لیے، کہ آج مجھے ہمیشہ کے لیے سبق مل گیا۔ میں چراغ ہوں اور جلنے کے لیے ہوں۔ میں یہ بات بھول گیا تھا۔ مگر خدا نے مجھے زیادہ بھٹکنے نہ دیا۔ میرا یہ جھونپڑا ہی میرے لیے جنت ہے۔ میں نے آج سمجھ لیا، کہ ادبی خدمت پوری عبادت ہے۔''

(آخری تحفہ)

مشق

I- درست جواب پر (✓) کا نشان لگائیں۔

i- حضرت قمر نے چائے کا پیالا تیار کیا۔

(الف) بیس دفعہ اُبالی ہوئی۔ (ب) تیس دفعہ اُبالی ہوئی۔

(ج) چالیس دفعہ اُبالی ہوئی۔ (د) پچاس دفعہ اُبالی ہوئی۔

ii- حضرت قمر کی رائے میں چائے میں دودھ ملانا

(الف) ہمارے رئیسوں کی ایجاد ہے۔ (ب) ہمارے غریبوں کی ایجاد ہے۔

(ج) ہمارے حکم رانوں کی ایجاد ہے۔ (د) ہماری عوام کی ایجاد ہے۔

iii- حضرت قمر کی بیوی کا نام تھا۔

(الف) رضیہ (ب) رفعیہ (ج) نصیبہ (د) سکینہ

iv- قمر صاحب کے پاس روپے کہاں سے آنے والے تھے؟

(الف) اخباروں سے (ب) دکان داروں سے (ج) رئیسوں سے (د) شاعروں سے

2- مختصر جواب لکھیں۔

i- قمر صاحب نے اپنے ہنسنے کے بارے میں کیا کہا؟

ii- قمر صاحب رئیس کے ہاں کیسے کپڑے پہن کر گئے؟

iii- قمر صاحب رئیس کے ہاں جاتے وقت کن لوگوں سے ملے؟

iv- قمر صاحب نے کارڈ مانگنے پر کیا کہا؟

v- قمر صاحب نے انگریزی ادب کے بارے میں کیا کہا؟

vi- قمر صاحب نے لکھنے پڑھنے کے کام کو عبادت کیوں کہا؟

vii- افسانہ نگار نے اس افسانے کا نام ''ادیب کی عزت'' کیوں رکھا؟

3- پریم چند کے افسانے ''ادیب کی عزت'' کا خلاصہ لکھیے۔

غلام عباس

(1909ء-1982ء)

اوورکوٹ

جنوری کی ایک شام کو ایک خوش پوش نوجوان ڈیوس روڈ سے گزر کر مال روڈ پر پہنچا اور چیرنگ کراس[1] کا رخ کر کے خراماں خراماں پٹڑی پر چلنے لگا۔ یہ نوجوان اپنی تراش خراش سے خاصا فیشن ایبل معلوم ہوتا تھا۔ چمکتے ہوئے بال، باریک باریک مونچھیں گویا سرے کی سلائی سے بنائی گئی ہوں، بادامی رنگ کا اوورکوٹ پہنے ہوئے جس کے کاج میں شربتی رنگ کے گلاب کا ایک آدھ کھلا پھول اٹکا ہوا، سر پر سبز فیلٹ ہیٹ ایک خاص انداز سے ٹیڑھی رکھی ہوئی، سفید سلک کا گلوبند گلے کے گرد لپٹا ہوا، ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں، دوسرے میں بید کی ایک چھوٹی چھڑی پکڑے ہوئے جسے کبھی کبھی وہ مزے میں آ کے گھمانے لگتا تھا۔

یہ ہفتے کی شام تھی۔ بھرپور جاڑے کا زمانہ۔ سرد اور تند ہوا کسی تیز دھات کی طرح جسم پر آ کے لگتی تھی مگر اس نوجوان پر اس کا کچھ اثر معلوم نہیں ہوتا تھا۔ لوگ خود کو گرم کرنے کے لیے تیز تیز قدم اٹھا رہے تھے مگر اسے اس کی ضرورت نہ تھی جیسے اس کڑکڑاتے جاڑے میں اسے ٹہلنے میں بڑا مزا آ رہا ہو۔

اس کی چال ڈھال سے ایسا بانکپن ٹپکتا تھا کہ تانگے والے دور ہی سے دیکھ کر سرپٹ گھوڑا دوڑاتے ہوئے اس کی طرف لپکتے مگر وہ چھڑی کے اشارے سے ''نہیں'' کر دیتا۔ ایک خالی ٹیکسی بھی اسے دیکھ کر رکی مگر اس نے ''نو تھینک یو'' کہہ کر اسے بھی ٹال دیا۔

جیسے جیسے وہ مال کے زیادہ بارونق حصے کی طرف پہنچتا جاتا تھا اس کی چونچالی بڑھتی ہی جاتی تھی۔ وہ منہ سے سیٹی بجا کے رقص کی ایک دھن نکالنے لگا۔ ایک دفعہ جب آس پاس کوئی نہیں تھا تو یک بارگی کچھ ایسا جوش آیا کہ اس نے دوڑ کر جھوٹ موٹ بال دینے کی کوشش کی گویا کرکٹ کا میچ ہو رہا ہے۔

راستے میں وہ سڑک آئی جو لارنس گارڈن[2] کی طرف جاتی تھی مگر اس وقت شام کے دھندلکے اور سخت کہرے میں اس باغ پر کچھ ایسی اداسی برس رہی تھی کہ اس نے ادھر کا رخ نہ کیا اور سیدھا چیرنگ کراس کی طرف چلتا رہا۔

اس نے اپنا رومال نکالا جسے جیب میں رکھنے کے بجائے اس نے کوٹ کی بائیں آستین میں اُڑس رکھا تھا اور ہلکے ہلکے چہرے پر پھیرا تاکہ کچھ کچھ گرد جم گئی ہو تو اتر جائے۔ پاس ہی گھاس کے ایک ٹکڑے پر کچھ بچے ایک بڑی سی گیند سے کھیل رہے تھے۔ وہ بڑی دلچسپی سے ان کا کھیل دیکھنے لگا۔ بچے کچھ دیر تک اس کی پروا کیے بغیر کھیل میں مصروف رہے مگر جب وہ برابر تکے ہی چلا گیا تو وہ رفتہ رفتہ

---

1. Chairing Cross پنجاب اسمبلی ہال کے سامنے لاہور کا ایک مشہور چوک۔

2. Lawrence Garden لاہور کا ایک معروف باغ جسے آج کل ''باغِ جناح'' کہتے ہیں۔

شرمانے سے لگے اور پھر اچانک گیند سنبھال کر، ہنستے ہوئے اور ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے گھاس کے اس ٹکڑے ہی سے چلے گئے۔

نوجوان کی نظر سیمنٹ کی ایک خالی بنچ پر پڑی اور وہ اس پر آ کے بیٹھ گیا۔ اس وقت شام کے اندھیرے کے ساتھ ساتھ سردی اور بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کی یہ شدّت ناخوشگوار نہ تھی۔

مال روڈ پر موٹروں اور بائیسکلوں کا تانتا بندھا ہوا تو تھا ہی پٹڑی پر چلنے والوں کی بھی کثرت تھی۔ علاوہ ازیں سڑک کی دو رویہ دکانوں میں خرید و فروخت کا بازار بھی گرم تھا۔ جن کم نصیبوں کو نہ تفریحِ طبع کی استطاعت تھی نہ خرید و فروخت کی وہ دور ہی سے کھڑے کھڑے ان تفریح گاہوں اور دکانوں کی رنگا رنگ روشنیوں سے جی بہلا رہے تھے۔

نوجوان سیمنٹ کی بنچ پر بیٹھا اپنے سامنے سے گزرتے ہوئے زن و مرد کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظر ان کے چہروں سے کہیں زیادہ ان کے لباس پر پڑتی تھی۔ ان میں ہر وضع اور ہر قماش کے لوگ تھے۔ بڑے بڑے تاجر، سرکاری افسر، لیڈر، فن کار، کالجوں کے طلبہ اور طالبات، نرسیں، اخباروں کے نمائندے، دفتروں کے بابو زیادہ تر لوگ اوورکوٹ[2] پہنے ہوئے تھے۔ ہر قسم کے اوورکوٹ، قراقلی کے بیش قیمت اوورکوٹ سے لے کر خاکی پٹی کے پرانے فوجی اوورکوٹ تک جنھیں نیلام میں خریدا گیا تھا۔

نوجوان کا اپنا اوورکوٹ تھا تو خاصا پرانا مگر اس کا کپڑا خوب بڑھیا تھا۔ پھر وہ سلا ہوا بھی کسی ماہر درزی کا تھا۔ اس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کی بہت دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ کالر خوب جما ہوا تھا۔ باہوں کی کریزیں بڑی نمایاں، سلوٹ کہیں نام کو نہیں، بٹن سینگ کے بڑے بڑے چمکتے ہوئے۔ نوجوان اس میں بہت مگن معلوم ہوتا تھا۔

ایک لڑکا پان بیڑی سگریٹ کا صندوقچہ گلے میں ڈالے سامنے سے گزرا۔ نوجوان نے آواز دی۔

''پان والا۔''

''جناب''

''دس کا چینج[1] ہے؟''

''ہے تو نہیں۔ لا دوں گا۔ کیا لیں گے آپ؟''

''نوٹ لے کے بھاگ گیا تو؟''

''اجی واہ! کوئی چور اچکا ہوں جو بھاگ جاؤں گا۔ اعتبار نہ ہو تو میرے ساتھ چلیے۔ لیں گے کیا آپ؟''

''نہیں نہیں ہم خود چینج لائیں گے۔ لو یہ اکنی نکل آئی۔ ایک سگریٹ دے دو اور چلے جاؤ۔''

لڑکے کے جانے کے بعد وہ سگریٹ کے کش لگانے لگا۔

ایک چھوٹی سی سفید رنگ کی بلی سردی میں ٹھٹھری ہوئی بنچ کے نیچے اس کے قدموں کے پاس آ کر میاؤں میاؤں کرنے لگی۔ اس

---

[1] Change۔ ریزگاری

نے پچکارا تو اچھل کر بنچ پر آ چڑھی۔ اس نے پیار سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور کہا ''پور لٹل سول[1]'' اب سات بج چکے تھے اور وہ مال کی پٹڑی پر پھر پہلے کی طرح مٹرگشت کرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ ایک ریستوران میں آرکسٹرا[2] بج رہا تھا۔ اندر سے کہیں زیادہ باہر لوگوں کا ہجوم تھا۔ ان میں زیادہ تر موٹروں کے ڈرائیور، کوچوان، پھل بیچنے والے جو اپنا مال بیچ کے خالی ٹوکرے لیے کھڑے تھے، کچھ راہ گیر جو چلتے چلتے ٹھہر گئے تھے، کچھ مزدوری پیشہ لوگ تھے اور کچھ گداگر۔ نوجوان پل بھر کے لیے رکا اور پھر آگے بڑھ گیا۔

راستے میں ایک چھوٹا سا بک سٹال پڑا۔ نوجوان یہاں بھی رکا۔ کئی تازہ رسالوں کے ورق الٹے۔ رسالہ جہاں سے اٹھاتا بڑی احتیاط سے وہیں رکھ دیتا۔ اور آگے بڑھا تو قالینوں کی ایک دکان نے اس کی توجہ کو جذب کیا۔ مالک دکان نے، جو ایک لمبا سا چغا پہنے اور سر پر کلاہ رکھے تھا، گرم جوشی سے اس کی آؤ بھگت کی۔

''ذرا یہ ایرانی قالین دیکھنا چاہتا ہوں۔ اُتاریے نہیں، یہیں دیکھ لوں گا۔ کیا قیمت ہے اس کی؟''

''چودہ سو بتیس روپے۔''

''نوجوان نے اپنی بھنوؤں کو سکیڑا جس کا مطلب تھا ''اوہو اتنی!''

دکاندار نے کہا ''آپ پسند کر لیجیے۔ ہم جتنی بھی رعایت کر سکتے ہیں کر دیں گے۔''

''شکریہ، لیکن اس وقت تو میں صرف ایک نظر دیکھنے آیا ہوں۔''

''شوق سے دیکھیے۔ آپ ہی کی دکان ہے۔''

دو تین منٹ کے بعد اس دکان سے بھی نکل آیا۔ اس کے اوورکوٹ کے کاج میں شربتی رنگ کے گلاب کا جو اَدھ کھلا پھول اٹکا ہوا تھا۔ وہ اس وقت کاج سے کچھ زیادہ باہر نکل آیا تھا۔ جب وہ اس کو ٹھیک کر رہا تھا تو اس کے ہونٹوں پر ایک خفیف اور پراسرار مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے پھر اپنی مٹرگشت شروع کر دی۔

اب وہ ہائی کورٹ کی عمارتوں کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ اتنا کچھ چل لینے کے بعد بھی اس کی طبیعت کی چونچالی میں کچھ فرق نہیں آیا تھا، نہ تکان محسوس ہوئی تھی نہ اکتاہٹ۔ یہاں پٹڑی پر چلنے والوں کی ٹولیاں کچھ چھٹ سی گئی تھیں اور ان میں کافی فاصلہ رہنے لگا تھا۔ اس نے اپنی بید کی چھڑی کو ایک انگلی پر گھمانے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی اور چھڑی زمین پر گر پڑی۔ ''اوسوری[3]'' کہ کر زمین پر جھکا اور چھڑی کو اٹھا لیا۔۔۔۔۔

نوجوان نے شام سے اب تک اپنی مٹرگشت کے دوران میں جتنی انسانی شکلیں دیکھی تھیں ان میں سے کسی نے بھی اس کی توجہ کو اپنی طرف منعطف نہیں کیا تھا۔ فی الحقیقت ان میں کوئی جاذبیت تھی ہی نہیں یا پھر وہ اپنے حال میں ایسا مست تھا کہ کسی دوسرے سے اسے سروکار ہی نہ تھا مگر ابھی اس نے آدھی ہی سڑک پار کی ہوگی کہ اینٹوں سے بھری ہوئی ایک لاری پیچھے سے بگولے کی طرح آئی اور

---

[1] Poor Little Soul۔ بے چاری ننھی سی جان
[2] Archestra۔ ساز
[3] Sorry۔ افسوس!

اسے روندتی ہوئی میکلوڈ روڈ[1] کی طرف نکل گئی۔ لاری کے ڈرائیور نے نوجوان کی چیخ سن کر پل بھر کے لیے گاڑی کی رفتار کم کی۔ وہ سمجھ گیا کہ کوئی لاری کی لپیٹ میں آ گیا اور وہ رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لاری کو لے بھاگا۔ دو تین راہ گیر جو اس حادثے کو دیکھ رہے تھے، شور مچانے لگے ''نمبر دیکھو، نمبر دیکھو۔'' مگر لاری ہوا ہو چکی تھی۔

اتنے میں کئی اور لوگ جمع ہو گئے۔ ٹریفک کا ایک انسپکٹر جو موٹر سائیکل پر جا رہا تھا رک گیا۔ نوجوان کی دونوں ٹانگیں بالکل کچل گئی تھیں۔ بہت سا خون نکل چکا تھا اور وہ سسک رہا تھا۔ فوراً ایک کار کو روکا گیا اور اسے جیسے تیسے اس میں ڈال کر ہسپتال روانہ کر دیا گیا جس وقت وہ ہسپتال پہنچا تو اس میں ابھی رمق بھر جان باقی تھی۔ اس ہسپتال کے شعبۂ حادثات میں اسسٹنٹ سرجن[2] مسٹر خان اور دو نوعمر نرسیں مس شہناز اور مس گل ڈیوٹی پر تھیں۔ جس وقت اسے سٹریچر[3] پر ڈال کے آپریشن روم[4] میں لے جایا جا رہا تھا تو ان نرسوں کی نظر اس پر پڑی۔ اس کا بادامی رنگ کا اوورکوٹ ابھی تک اس کے جسم پر تھا اور سفید سلک کا مفلر گلے میں لپٹا ہوا تھا۔ اس کے کپڑوں پر جا بجا خون کے بڑے بڑے دھبے تھے۔ کسی نے ازراہِ دردمندی اس کی سبز فلیٹ ہیٹ اٹھا کے اس کے سینے پر رکھ دی تھی تاکہ کوئی اڑا نہ لے جائے۔

شہناز نے گل سے کہا ''کسی بھلے گھر کا معلوم ہوتا ہے بے چارہ۔''

گل دبی آواز میں بولی ''خوب بن ٹھن کے نکلا تھا بے چارہ۔''

''ڈرائیور پکڑا گیا یا نہیں؟''

''نہیں، بھاگ گیا۔''

''کتنے افسوس کی بات ہے۔''

آپریشن روم میں اسسٹنٹ سرجن اور نرسیں چہروں پر جراحی کے نقاب چڑھائے، جنھوں نے ان کی آنکھوں سے نیچے کے سارے حصے کو چھپا رکھا تھا، اس کی دیکھ بھال میں مصروف تھے۔ اسے سنگ مرمر کی میز پر لٹا دیا گیا۔ اس نے سر میں جو تیز خوش بودار تیل ڈال رکھا تھا اس کی کچھ کچھ مہک ابھی تک باقی تھی۔ پٹیاں ابھی تک جمی ہوئی تھیں۔ حادثے سے اس کی دونوں ٹانگیں تو ٹوٹ چکی تھیں مگر سر کی مانگ نہیں بگڑنے پائی تھی۔

اب اس کے کپڑے اتارے جا رہے تھے۔ سب سے پہلے سفید سلک کا گلوبند اس کے گلے سے اتارا گیا۔ اچانک نرس شہناز اور نرس گل نے بیک وقت ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اس سے زیادہ وہ کر بھی کیا سکتی تھیں۔ چہرے، جو دلی کیفیات کا آئینہ ہوتے ہیں جراحی کے نقاب تلے چھپے ہوئے تھے اور زبانیں بند۔

نوجوان کے گلوبند کے نیچے نکٹائی اور کالر تو کیا، سرے سے قمیص ہی نہیں تھی۔ اوورکوٹ اتارا گیا تو نیچے سے ایک بوسیدہ اونی سویٹر نکلا جس میں جا بجا بڑے بڑے سوراخ تھے۔ ان سوراخوں سے سویٹر سے بھی زیادہ بوسیدہ اور میلا کچیلا ایک بنیان نظر آ رہا تھا۔ نوجوان سلک کے گلوبند کو کچھ اس ڈھب سے گلے پر لپیٹے رکھتا تھا کہ اس کا سارا سینہ چھپا رہتا تھا۔ اس کے جسم پر مَیل کی تہیں بھی خوب چڑھی

---

[1] Mcleod Road۔ لاہور کی ایک مشہور سڑک جو ریلوے سٹیشن تک جاتی ہے۔

[2] Assistant Surgeon۔ معاون سرجن [3] Stretcher۔ جس پر لٹا کر مریض کو لے جاتے ہیں۔

[4] Operation Room۔ کمرا جہاں آپریشن کیے جاتے ہیں۔

ہوئی تھیں۔ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کم سے کم پچھلے دو مہینے سے نہیں نہایا۔ البتہ گردن خوب صاف تھی اور اس پر ہلکا ہلکا پوڈر لگا ہوا تھا۔ سویٹر اور بنیان کے بعد پتلون کی باری آئی۔ پتلون کو پیٹی کے بجائے ایک پرانی دھجی سے جو شاید کبھی نکٹائی[1] ہوگی خوب کس کے باندھا گیا تھا۔ بٹن اور بکسوئے غائب تھے۔ دونوں گھٹنوں پر سے کپڑا مسک گیا تھا اور کئی جگہ کھونچیں بھی لگی تھیں مگر چونکہ یہ حصے اوور کوٹ کے نیچے رہتے تھے اس لیے لوگوں کی ان پر نظر نہیں پڑتی تھی۔

اب بوٹ اور جرابوں کی باری آئی اور ایک مرتبہ پھر مس شہناز اور مس گل کی آنکھیں چار ہوئیں۔

بوٹ تو پرانے ہونے کے باوجود خوب چمک رہے تھے مگر ایک پاؤں کی جراب دوسرے پاؤں کی جراب سے بالکل مختلف تھی۔ پھر دونوں جرابیں پھٹی ہوئی بھی تھیں۔ اس قدر کہ ان میں سے نوجوان کی میلی میلی ایڑیاں نظر آ رہی تھیں۔

بلاشبہ اس وقت تک وہ دم توڑ چکا تھا۔ اس کا جسم سنگِ مرمر کی میز پر بے جان پڑا تھا۔ اس کا چہرہ جو پہلے چھت کی سَمت تھا کپڑے اتارنے میں دیوار کی طرف مڑ گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جسم اور اس کے ساتھ روح کی اس برہنگی نے اسے خجل کر دیا ہے اور وہ اپنے ہم جنسوں سے آنکھیں چرا رہا ہے۔

اس کے اوور کوٹ کی مختلف جیبوں سے جو چیزیں برآمد ہوئیں وہ یہ تھیں:

ایک چھوٹا سا سیاہ کنگھا، ایک رومال، ساڑھے چھے آنے، ایک بجھا ہوا آدھا سگریٹ، ایک چھوٹی سی ڈائری جس میں لوگوں کے نام اور پتے لکھے تھے، نئے گراموفون ریکارڈوں کی ایک ماہانہ فہرست اور کچھ اشتہار جو مٹر گشت کے دوران میں اشتہار بانٹنے والوں نے اس کے ہاتھ میں تھما دیے تھے اور اس نے انھیں اوور کوٹ کی جیب میں ڈال لیا تھا۔

افسوس کہ اس کی بید کی چھڑی جو حادثے کے دوران میں کہیں کھو گئی تھی، اس فہرست میں شامل نہ تھی۔

(جاڑے کی چاندنی)

---

[1] Necktie

مشق

-1 افسانہ ''اوورکوٹ'' کا متن پیشِ نظر رکھتے ہوئے درج ذیل جملوں میں دیے گئے الفاظ میں سے درست لفظ کا انتخاب کر کے خالی جگہ پُر کریں:

-i جب وہ برابر.......... چلا گیا تو رفتہ رفتہ وہ شرمانے سے لگے۔ (تکے، دیکھے، گھورے)

-ii نوجوان اپنی.......... سے خاصا فیشن ایبل معلوم ہوتا تھا۔ (تراش خراش، صورت، شکل)

-iii نوجوان نے.......... کو سکیڑا جس کا مطلب تھا ''اوہو اتنی۔'' (بھنوؤں، ہونٹوں، کندھوں)

-iv اُس کے ہونٹوں پر ایک.......... اور پُراسرار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ (خفیف، لطیف، عجیب)

-2 نیچے دیے گئے سوالات اور سبق ''اوورکوٹ'' کو پیشِ نظر رکھ کر درست جواب کے شروع میں ''✓'' لگائیں۔

-i افسانہ ''اوورکوٹ'' کا مصنف کون ہے؟

(ا) پریم چند (ب) افضل حق (ج) غلام عباس (د) ممتاز مفتی

-ii نوجوان نے ''اوورکوٹ'' کیوں پہن رکھا تھا؟

(ا) کیوں کہ اُس کے پاس کوئی اور لباس نہ تھا۔ (ب) کیوں کہ جاڑے کا موسم تھا۔

(ج) خوب صورت نظر آنے کے لیے۔ (د) اپنی اصلیت کو چھپانے کے لیے۔

-iii گلوبند اتارنے کے بعد نرسوں نے ایک دوسرے کی طرف کیوں دیکھا؟

(ا) کیوں کہ گلوبند بے حد خوب صورت تھا۔ (ب) کیوں کہ گردن پر گلوبند کا نشان تھا۔

(ج) کیوں کہ گلوبند پھٹ گیا تھا۔ (د) کیوں کہ گلوبند کے نیچے قمیص ہی نہ تھی۔

-iv نوجوان کی پتلون کیسی تھی؟

(ا) بالکل عام سی اور سادہ۔ (ب) پرانی اور جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی۔

(ج) نہایت شان دار۔ (د) پھٹی پرانی اور بکسوؤں کے بغیر۔

-v ''اوورکوٹ'' کا اختتام کس چیز کے ذکر پر ہوا؟

(ا) فیلٹ ہیٹ پر۔ (ب) بید کی چھڑی پر۔

(ج) اوورکوٹ پر۔ (د) گلوبند پر۔

-vi افسانہ نگار نے کس اوورکوٹ کو نیلام کا کہا؟

(ا) قراقلی اوورکوٹ کو۔ (ب) عوامی اوورکوٹ کو۔

(ج) خاکی پٹی والے اوورکوٹ کو۔ (د) خاکی پٹی کے پرانے فوجی اوورکوٹ کو۔

vii- سفید بلی دیکھ کر نوجوان نے کیا کہا؟

(الف) پور لٹل سول! (ب) نو، تھینک یو!

(ج) گڈ ایوننگ! (د) سوری!

viii- نوجوان کو حادثہ کس سڑک پر جاتے ہوئے پیش آیا؟

(الف) ڈیوس روڈ پر (ب) لارنس روڈ پر

(ج) مال روڈ پر (د) میکلوڈ روڈ پر

3- درج ذیل سوالات کے مختصر جواب تحریر کریں جو تین سطروں سے زائد نہ ہوں۔

i- مٹر گشت کرنے والے نوجوان کا ظاہری حلیہ کیسا تھا؟

ii- افسانہ ''اوورکوٹ'' میں اوورکوٹ کن خصوصیات کا حامل تھا؟

iii- نوجوان نے اوورکوٹ کے علاوہ کیا کچھ زیب تن کر رکھا تھا؟

iv- نوجوان کے اوورکوٹ کی جیب سے کون کون سی چیزیں برآمد ہوئیں؟

v- افسانہ نگار نے ''اوورکوٹ'' میں کن سڑکوں کا ذکر کیا ہے؟ ان کے نام لکھیے۔

vi- اس افسانے میں انگریزی زبان کے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان کے معنی لکھیں۔

4- افسانہ ''اوورکوٹ'' کا خلاصہ تحریر کریں جو اصل کے ایک تہائی سے زائد نہ ہو۔

5- مندرجہ ذیل الفاظ کے متضاد لکھیں:

شام، لمبی لمبی، باریک باریک، سرد، بارونق۔

6- اپنے کالج میں بزمِ ادب یا ٹیوٹوریل گروپ میں اپنے تحریر شدہ یا اپنے پسندیدہ افسانے فرداً فرداً پڑھ کر سنائیں۔

7- اپنے کالج میگزین کے لیے کوئی افسانہ لکھیں۔

8- غلام عباس کا افسانہ ''بہروپیا'' یا ''کتبہ'' پڑھیں اور اپنے تاثرات اپنی ڈائری میں لکھیں۔

احمد ندیم قاسمی

(1916ء-2006ء)

سِفارِش

محلّے کی بڑی گلی کے موڑ پر تین چار تانگے ہر وقت موجود رہتے ہیں مگر اس روز میں موڑ پر آیا تو وہاں ایک بھی تانگا نہیں تھا۔ مجھے خاصی دور بھی جانا تھا اور جلدی بھی پہنچنا تھا، اس لیے تانگے کا انتظار کرنے لگا۔ تانگے تو بہت سے گزرے مگر سب لگے ہوئے تھے۔ اچانک میں نے فیکے کوچوان کو اپنی طرف آتے دیکھا تو پکارا ''بھئی فیکے تانگا کہاں ہے؟ تانگا لاؤ نا۔''

''تانگا تو بابو جی، آج نہیں جوڑا ہے۔'' فیکے نے جواب دیا۔

میں نے دیکھا کہ فیکا جو کوچوان کا کوچوان اور پہلوان کا پہلوان تھا اس نے آج شیو بھی نہیں بنوایا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی سرے سے محروم تھیں اور بوٹی کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔

''کیا بات ہے فیکے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولا: ''بابو جی ایک کام ہے۔''

''ہاں ہاں کہو۔'' میں نے کہا

''کام یہ ہے بابو جی کہ آپ میرے بابا کو تو جانتے ہیں نا؟'' فیکا بولا۔ ''اس کی ایک آنکھ چلی گئی ہے۔''

''اوہو: مجھے دکھ ہوا۔ کیسے گئی؟ کیا کوئی حادثہ ہوا؟''

''جی نہیں'' فیکے کے چہرے پر بھول پن کا چھینٹا پڑ گیا۔

''لال لال تو وہ ہر وقت رہتی تھی اور اس میں سے پانی بہتا رہتا تھا۔ آپ تو جانتے ہیں۔ آپ تو بابا کے ساتھ کئی بار تانگے پر بیٹھے ہیں۔ تو بابو جی کل کیا ہوا کہ بابا مصری شاہ میں سے گزرا تو ایک حکیم سرمہ بیچ رہا تھا۔ بابا یہ سرمہ لے آیا اور ہمیں بتایا کہ اس سے آنکھ کی لالی جاتی رہے گی۔ حکیم نے خدا رسولؐ کی قسم کھا کے کہا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ نہ جائے تو قیامت کے دن مجھے گردن سے پکڑنا۔ میں نے بھی کہ دیا کہ حکیم خدا رسولؐ کو بیچ میں ڈال رہا ہے تو ذرا سا لگا لے۔ اماں نے بھی یہی صلاح دی۔ اُس نے ''لقمان حکیم، حکمت کا بادشاہ'' پڑھا اور آنکھ میں سلائی پھیر لی۔ بس پھر کیا تھا بابو جی، قسم کھا کر کہتا ہوں جب سے اب تک آنکھ گئی ہو۔ بابو جی، آپ تھک تو نہیں گئے؟ سگریٹ والے کی کرسی اٹھا لاؤں؟''

اس وقت فیکا مجھے ایسا لگا جیسے اس کے چوڑے چکلے سینے پر گڈے کا حیران سر رکھا ہوا ہے۔ میں نے کہا: ''تم بھی حد کرتے ہو فیکے۔ اب آگے بھی کہو نا۔''

فیکے کی آنکھوں میں ممنونیت کی نمی جاگی۔ وہ بولا: ''بس بابو جی خدا آپ کا بھلا کرے۔ رات تو چیخ چاخ کے گزار دی۔ پھر صبح کو محلّے کے سارے کوچوان اکٹھے ہوئے تو ان میں سے چچا شیدے نے کہا کہ پوست کے ڈوڈے پانی میں ابالو اور اسی پانی سے آنکھ دھوؤ۔ دھوئی پر بابا اسی طرح تڑپتا رہا۔ پھر کسی نے کہا کہ پالک کا ساگ اُبال کر باندھو، باندھا اور جب کھولا تو بابا نے صاف کہ دیا کہ اب کیا جتن کرتے ہو آنکھ کا دیا تو بجھ گیا۔ ہمارے گھر میں تو پٹس پڑ گئی بابو جی۔ اُسے ایک ہسپتال میں لے گئے، پھر دوسرے میں لے گئے۔ دونوں میں جگہ نہ تھی۔ دوپہر کو راج گڑھ کے ایک کوچوان نے بتایا کہ اس کا سالا میو ہسپتال[1] میں چوکی دار ہے۔ اُس کی سفارش سے جگہ تو مل گئی پر برانڈے میں۔ وہ بھی کوئی ایسی بات نہیں۔ پر بابو جی شام ہونے کو آئی ہے اور ابھی تک کوئی ڈاکٹر تو کیا کوئی نرس بھی ادھر نہیں آئی۔ آپ صاحب لوگ ہیں یہ دیکھیے ہاتھ باندھتا ہوں۔ میرے ساتھ چل کر کسی ڈاکٹر سے یہ کہ دیجیے کہ صدقے مریض کو ذرا سا دیکھ لے۔''

میں نے کہا ''وہاں ایک ڈاکٹر ہے، ڈاکٹر عبدالجبار۔ ان سے میرا سلام کہو۔ کام ہو جائے گا۔ نہ ہوا تو کل میں تمھارے ساتھ چلوں گا۔ اس وقت مجھے ایک دعوت میں جانا ہے، نام یاد کرلو ڈاکٹر عبدالجبار۔''

فیکا میرے بہت سے شکریے ادا کر کے چلا گیا۔ پھر مجھے ایک خالی تانگا مل گیا۔ جب تانگا میو ہسپتال کے صدر دروازے کے سامنے سے گزرا تو میں نے دیکھا کہ فیکا ایک چوکی دار سے باتیں کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر جبار کا پتا پوچھ رہا ہوگا۔ ایک بار جی میں آئی کہ ہسپتال جا کر جبار صاحب سے کہ دوں مگر اب تانگا آگے نکل گیا تھا اور مجھے پہلے ہی دیر ہو گئی تھی۔

کچھ دور جا کر گھوڑا پھسل کر گرا اور دس منٹ تک گرا رہا۔ پھر جب اٹھا اور چلنے لگا تو یکا یک جبار صاحب کا سکوٹر میرے تانگے کے قریب سے زن سے گزر گیا۔ ''جبار صاحب!'' میں چلایا مگر جبار صاحب میری آواز سے تیز نکلے۔

کوئی بات نہیں، میں نے سوچا، کل کہ دوں گا۔ کل پہلا کام ہی یہی کروں گا۔

رات کو میں گھر واپس آیا تو معلوم ہوا کہ فیکا کوچوان آیا تھا اور کہ گیا تھا کہ بابو آئیں تو مجھے بلالیں۔

میں نے سوچا، اس وقت کون بلائے۔ اگر جبار صاحب ہسپتال ہی کو جا رہے تھے اور فیکے کا کام ہو گیا ہے تو شکریہ صبح قبول کرلوں گا اور اگر کام نہیں ہوا تو جو بھی کوشش ہوگی صبح ہی کو ہوگی۔

صبح کو میں ابھی بستر سے نہیں نکلا تھا کہ فیکے نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ معلوم ہوا کہ رات جبار صاحب ڈیوٹی پر نہیں تھے۔ ان کی ڈیوٹی آج دن کی ہے۔

''یعنی تمھارا باپ دسمبر کی اس سردی میں برآمدے ہی میں پڑا رہا؟'' میں نے اپنے انداز میں تشویش ظاہر کی۔

''جی ہاں'' وہ بولا ''مگر یہ تو کوئی ایسی بات نہیں بابو جی۔ آپ نے ہمارا گھر نہیں دیکھا۔ دس سال سے چھپر میں پڑے ہیں۔''

''اور اس کی آنکھ؟'' میں نے پوچھا۔

---

[1] Mayo Hospital۔ لاہور کا سب سے بڑا ہسپتال جو دنیا بھر میں مشہور ہے۔

''وہ تو چلی گئی بابو جی۔'' فیکا یوں بولا جیسے اس کے باپ کی آنکھ کو ضائع ہوئے برسوں گزر چکے ہیں۔

میں نے کہا: ''جب آنکھ جا ہی چکی ہے تو بے چارے بڈھے کو ہسپتال میں کیوں گھسیٹتے پھرتے ہو؟ وقت بھی ضائع ہوگا روپیا بھی ضائع ہوگا۔''

فیکا بولا: ''بابو جی کیا پتا آنکھ کے کسی کونے کھدرے میں بینائی کا بھورا پڑا رہ گیا ہو۔ دیکھیے چولھا بجھ جاتا ہے تو جب بھی دیر تک راکھ میں ہاتھ نہیں ڈالتے۔ کیا پتا کوئی چنگاری سُلگ رہی ہو۔''

میں اس بات سے چونکا۔ آج تک فیکے نے مجھ سے صرف چارے کی مہنگائی اور آٹے میں ملاوٹ کے موضوع پر باتیں کی تھیں۔ پھر وہ عاجزی سے بولا ''ذرا سا میرے ساتھ چلیے۔''

میرے جسم میں نیند ابھی پوری طرح غائب نہیں ہوئی تھی۔ پھر نہانا تھا۔ شیو کرنا تھا۔ چائے پینی تھی۔ میں نے کہا ''میں تمھیں اپنا کارڈ دیے دیتا ہوں۔ وہ ڈاکٹر جبّار کو دکھا دو۔ بڑے یار آدمی ہیں۔ فٹافٹ کام کر دیں گے۔ تمھارا باپ ایک بار وارڈ میں چلا جائے، پھر علاج کے لیے تو میں خود جا کر کہوں گا۔''

وہ مجھ سے کارڈ لے کر یوں چلا جیسے دنیا جہاں کی دولت سمیٹے لیے جا رہا ہے۔ میں نے کارڈ پر لکھ دیا تھا۔ جبّار صاحب! اس کا کام کر دیجیے، بے چارا بڑا ہی غریب آدمی ہے۔ دعائیں دے گا۔ اور مجھے یقین تھا کہ کام ہو جائے گا۔ ڈاکٹروں کو صرف اتنا ہی تو دیکھنا تھا کہ آنکھ پوری طرح بجھ گئی ہے یا تھوڑی بہت رمق باقی ہے۔

میں دن بھر گھر سے غائب رہا اور فیکا دن بھر میرے گھر کے چکر کاٹتا رہا۔ شام کو اُس نے مجھے بتایا کہ ''جبّار صاحب بیٹھے تو ہیں پر کوئی اندر نہیں جانے دیتا۔ کہتے ہیں باری سے آؤ اور میری باری آتی ہی نہیں۔ گھٹنا پاجامے میں سے جھانک رہا ہو تو باری کیسے آئے بابو جی۔''

فیکے نے مجھے ایک بار پھر چونکا دیا۔ نہ جانے پہلوان فیکے کے اندر یہ حساس فیکا اتنے برسوں سے کہاں چھپا بیٹھا تھا۔

میں نے وعدہ کیا کہ کل ضرور چلوں گا۔ اب تو شام ہو گئی ہے۔

دوسرے دن سویرے ہی مجھے شیخوپورے جانا پڑ گیا۔ رات کو واپس آیا تو معلوم ہوا کہ فیکا آیا تھا۔

اس کے بعد تین دن تک میں نے زیادہ وقت گھر میں گزارا مگر فیکا نہ آیا۔ چوتھے روز میں نے گلی کے موڑ پر ایک کوچوان سے فیکے کے باپ کا پوچھا تو معلوم ہوا کہ اسے وارڈ میں جگہ مل گئی ہے۔ اتنے میں فیکا بھی آنکلا۔ مجھے ذرا سی ندامت تھی، اس لیے جھوٹ بولنا پڑا۔ ''کیوں فیکے، جبّار صاحب نے کام کر دیا نا؟''

وہ بولا۔ ''مگر بابو جی، وہ تو مجھ سے ملے ہی نہیں۔''

میں نے فوراً کہا۔ ''میں نے انھیں فون کر دیا تھا۔''

فیکے کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں ممنونیت کی نمی جاگ اٹھی۔ ''جبھی میں کہوں نرس بار بار یہ کیوں کہہ رہی ہے کہ دیکھو، بڈھے کو تکلیف نہ ہو۔''

پھر میں وہاں سے چلا آیا۔ میرے قدم آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے مگر ذہن جیسے شکست کھا کر بھاگا جا رہا تھا۔ رات کو نیند نے ندامت دور کر دی مگر صبح ہی فیکا دروازے پر موجود تھا۔ بولا ''آپ کی مہربانی سے داخلہ تو مل گیا تھا پر اب انھوں نے بابا کو کوٹ لکھپت کے ہسپتال میں بھیج دیا ہے۔ یہ تو بڑا غضب ہوا بابو جی۔ آج میں اماں کو ساتھ لے کر گیا۔ دو روپے لگ ہو گئے۔ کچھ ہو سکے تو کیجیے۔''

میں نے کہا۔ ''میں ابھی جا کر ڈاکٹر جبار کو فون کرتا ہوں۔''

میں نے فون کیا بھی مگر ڈاکٹر صاحب مل نہ سکے۔ پھر مصروفیتوں میں بات آئی گئی ہو گئی۔ پانچ چھے روز بعد میں نے فیکے کو دیکھا تو سوچا کہ نظریں چرا کے ساتھ والی گلی میں مڑ جاؤں اور وہاں سے بھاگ نکلوں۔ مگر فیکا لپک کر میرے پاس آیا اور بولا۔ ''بابو جی' سمجھ میں نہیں آتا آپ کے کس کس احسان کا بدلہ اتاروں گا۔''

جھوٹ نے میری ندامت کو کان سے پکڑ کر ایک طرف ہٹا دیا۔ ''واپس آ گیا نا تمھارا بابا؟''

فیکا بولا۔ ''واپس بھی آ گیا اور اپریشن بھی ہو گیا۔ جمعے کو پٹی کھل رہی ہے۔ دعا کیجیے۔''

میں نے کہا۔ ''اللہ رحم کرے گا۔''

پھر وہ جمعے کی شام کو آیا تو بولتے ہی زار زار رونے لگا۔ ''بابو جی غضب ہو گیا پٹی کھلی تو پتا چلا۔ ایک آنکھ تو گئی ہی تھی، دوسری پر بھی اثر پڑ گیا ہے۔ کہتے ہیں اب پہلے اپریشن کا زخم ملے تو دوسرا اپریشن ہو گا اور دوسری آنکھ کا بھی ہو گا۔''

میں نے اسے تسلی دی اور اسے ساتھ لے کر سامنے ہی ایک دکان سے ڈاکٹر جبار کو فون کیا مگر بدقسمتی سے وہ فون پر موجود نہ تھے۔ پھر میں نے اس سے وعدہ کیا کہ کل جا کر ڈاکٹر جبار سے ملوں گا۔ وہ ہسپتال میں نہ ہوئے تو انھیں گھر میں جا پکڑوں گا۔

دوسرے دن میں جا تو نہ سکا البتہ ڈاکٹر جبار کو فون ضرور کیا۔ وہ پھر غائب تھے۔

ادھر فیکا بھی غائب ہو گیا۔

شاید دو ڈھائی ہفتے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ نوکر نے آ کر بتایا کہ فیکا کوچوان آیا ہے۔ میں نے بھی اسے کھڑکی میں سے دیکھ لیا۔ بالکل ہلدی ہو رہا تھا۔

میں نے نوکر سے پوچھا۔ ''کیا تم نے اسے بتا دیا ہے کہ میں موجود ہوں؟''

''جی ہاں۔'' نوکر بولا۔ ''بس میرے منہ سے نکل گیا۔''

''بڑے احمق آدمی ہو۔'' میں نے اسے ڈانٹا اور کہا۔ ''جاؤ کہ دو کپڑے بدل رہے ہیں۔ آتے ہیں۔''

کپڑے تو میں نے بدل رکھے تھے البتہ میں اپنے تیور بدلنے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر اچانک خیال آیا کہ کتنا چھوٹا آدمی ہوں دو پیسے یا دو روپے یا چلو دو لاکھ کی بھی بات نہیں۔ دو آنکھوں کی بات ہے اور میں جھوٹ بولے جا رہا ہوں۔ مجھے فیکے کے سامنے اعتراف کر

لینا چاہیے کہ میں تمھارے لیے کچھ نہیں کر سکا۔ پھر میں نے وہ فقرے سوچے جو مجھے فیکے کے سامنے اس انداز سے ادا کرنے تھے کہ اسے سچی بات بھی معلوم ہو جائے اور اسے دکھ بھی نہ ہو۔

میں باہر آیا تو فیکا بولتے ہی زار زار رونے لگا۔ بابو جی' کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ، کچھ سمجھ میں نہیں آتا............'' اس کی آواز بھرا گئی۔

میرے سوچے ہوئے فقرے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے بمشکل میں نے کہا۔ ''فیکے بات یہ ہے فیکے کہ...... بات یہ ہے......''

آنسوؤں سے بھیگا ہوا، بچوں کی طرح گول گول سرخ چہرہ لیے فیکا اٹھا اور بولا' بابو جی! کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میں شکریہ ادا کروں تو کیسے کروں'' میرا ابا ٹھیک ہو گیا ہے۔ اس کی دونوں آنکھیں ٹھیک ہو گئی ہیں۔ اُسے بینائی اللہ نے دی ہے اور آپ نے دی ہے۔ آپ نے مجھے خرید لیا ہے بابو جی۔ قسم خدا کی میں عمر بھر آپ کا نوکر رہوں گا۔''

اور میں نے ایک بہت لمبی، بہت گہری سانس لے کر کہا۔'' کوئی بات نہیں فیکے۔ کوئی بات نہیں۔''

(کپاس کا پھول)

مشق

1- افسانہ '' سفارش'' پیشِ نظر رکھتے ہوئے درج ذیل جملے مکمل کریں۔

i- جی نہیں فیکے کے چہرے پر.................. کا چھینٹا پڑ گیا۔

ii- فیکے کی آنکھوں میں.................. کی نمی جا گی۔

iii- کیا پتا آنکھ کے کسی کونے کھدرے میں.................. کا بھورا پڑا رہ گیا ہو۔

iv- گھٹنا پا جاے میں سے.................. رہا ہو تو باری کیسے آئے بابو جی۔

v- جھوٹ نے میری.................. کو کان سے پکڑ کر ایک طرف ہٹا دیا۔

2- '' سفارش'' کا متن مدِ نظر رکھتے ہوئے درج ذیل سوالات کے مختصر جواب تحریر کریں جو تین سطور سے زائد نہ ہوں۔

i- فیکے کے باپ کی بینائی کیوں جاتی رہی؟

ii- سفارش کرنے والے نے 'کارڈ' پر کیا لکھا؟

iii- سفارش کرنے والے نے فیکے کی موجودگی میں ڈاکٹر جبار کو کب فون کیا؟

iv- سفارش کرنے والے نے اپنے نوکر کو کیوں ڈانٹا؟

v- فیکے نے عمر بھر مصنف کا نوکر رہنے کا اعلان کیوں کیا؟

3- '' سفارش'' کا مرکزی خیال تحریر کریں۔

4- '' سفارش'' کا خلاصہ تحریر کریں جو افسانے کے اصل متن کے ایک تہائی سے زیادہ نہ ہو۔

5- سیاق و سباق کے حوالے سے درج ذیل پیرا گراف کی تشریح کریں:

فیکے کی آنکھوں میں ممنونیت کی نمی جا گی.................. مریض کو ذرا سا دیکھ لے۔

ہاجرہ مسرور
(1929ء - 2012ء)

چراغ کی لَو

شام کی بڑھتی ہوئی اداس تاریکی میں سامنے کی ہر چیز آہستہ آہستہ دھندلی پڑتی جارہی تھی۔اس نے نظریں پھرا پھرا کر بغیر پلستر کی دیواروں کو دیکھنا شروع کیا جو اندھیرے میں ڈوب کر بھیانک ہوتی چلی جارہی تھیں جیسے وہ سیاہ رنگ میں نہا گئی ہوں!............اندھیرا اور تنہائی! اس کا جی الٹنے لگا تو کھانستی ہوئی اٹھ کر بیٹھ گئی............اسے اپنے باپ کا انتظار تھا جو کام پر سے آ کر جانے کہاں چلتا بنا تھا۔

''نہ جانے کہاں بیٹھ رہے ابا؟ یہ خیال نہیں آتا کہ اکیلے گھر میں جی گھبراتا ہوگا میرا۔'' وہ جھنجھلاہٹ میں رہ رہ کر بس یہی سوچ رہی تھی۔اس کا جی چاہ رہا تھا کہ زور زور سے رونے لگے۔لیکن آنسوؤں کا ذخیرہ جیسے حلق میں اٹک کر رہ گیا تھا۔اس سے رویا بھی نہ گیا۔

اس نے دوبارہ اچک کر ادھر اُدھر دیکھنا شروع کیا تو ہر طرف بس یوں نظر آنے لگا جیسے نئے سفید کپڑوں میں لپٹے ہوئے ڈھانچے سامنے کی اندھیری کوٹھڑی سے نکل نکل کر سارے گھر میں گھوم پھر رہے ہوں............اس کے ذہن پر ان ڈھانچوں کی ہڈیوں کی چیخ اور نئے سفید کپڑوں کی مدھم کھڑکھڑاہٹ اس طرح چھا گئی کہ وہ آنکھیں میچ کر دوبارہ چارپائی پر لڑھک گئی............بالکل بے حس و حرکت جیسے اس کا دم ہی نکل گیا ہو............سفید کپڑوں میں لپٹے ہوئے ڈھانچوں کی ہڈیوں کی چیخ اور کپڑوں کی کھڑکھڑاہٹ۔یہ تو بس اس کا وہم ہی وہم تھا۔کچھ دنوں سے جسم کے ساتھ ساتھ اس کا دماغ بھی بہت کمزور ہو گیا تھا۔رات تو خیر رات ہی تھی۔وہ دن دوپہر بھی اکثر یہی وہم کرتی............بس جدھر بھی نظر جما کر دیکھتی یہی لگتا کہ کوئی سفید سفید کپڑوں میں لپٹا چلا آ رہا ہے۔بالکل اسی وضع کے کپڑے جو اس کی ماں کو مرنے کے بعد پہنائے گئے تھے۔دروازہ مانوس طریقے پر چرمرایا اور پھر کھٹ سے بند ہو گیا اور اس نے کپکپا کر آنکھیں کھول دیں۔جب کچھ نظر نہ پڑا تو مری ہوئی آواز میں بولی۔

''کون ہے؟''

''میں ہوں اچھن۔'' یہ اس کے باپ کی آواز تھی۔

''کہاں تھے ابا؟ میرا دل اکیلے میں گھبرا رہا تھا۔'' اس نے شکایت کی تو جیسے اس کے حلق میں آنسوؤں کا ذخیرہ دوبارہ پھنس گیا اور آنکھیں تپنے لگیں۔

''ذرا کام سے گیا تھا............چراغ نہیں جلایا؟'' باپ نے چارپائی کے پائے سے ٹھوکر کھائی تو جھلا کر پوچھا اور اپنی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''دیا سلائی نہیں تھی۔''

''یہ لو دیا سلائی۔'' باپ نے جیب سے دیا سلائی نکال کر ایک بیڑی سلگائی تو دیا سلائی کی روشنی میں اس کا چہرہ بڑا وحشت زدہ

سانظر آیا۔ الجھی ہوئی کھچڑی ڈاڑھی، ہونٹوں پر اوندھی ہوئی مونچھیں، لکیروں سے پٹی ہوئی پیشانی اور ابلی ہوئی آنکھیں .... تیلی جل کر ایک ننھی سی سرخ کمان کی طرح خم کھا گئی اور چرمراتی ہوئی بیڑی کا دھواں چھوٹے سے آنگن میں پھیل گیا۔

''اوں......... نہہ اوں'' وہ کانکھتی ہوئی پٹی پر زور دے کر اٹھ بیٹھی۔ بیڑی کے دھویں سے اس کا جی متلا رہا تھا۔

''کیسا جی ہے اچھن؟'' باپ نے بیڑی کا ایک طویل کش لیا تو ہلکی سی سرخ روشنی میں اس کی ابلی ہوئی آنکھیں چمک گئیں۔

''بیڑی نہ پیو ابا!......... اس کے دھویں سے میرا جی الٹتا ہے'' اور وہ اپنے بخار سے بھاری سر کو کندھوں پر جھکا جھکا کر بیزاری سے کانکھنے لگی۔

باپ کو غصہ آ گیا۔ کتنی دیر بعد تو اس نے بیڑی سلگائی تھی۔ جب سے بیڑی کا بنڈل چھے پیسے کا ہو گیا تھا وہ تمام دن اور رات میں صرف چار بیڑیاں پیتا۔ مارے طلب کے جماہیوں پر جماہیاں آتیں۔ لیکن اپنا جی مارتا اور اس وقت بیٹی نے حکم لگا دیا کہ نہ پیو۔

''تیرا جی تو ہر بات میں الٹا کرتا ہے......... کچھ دماغ چل گیا ہے تیرا؟'' باپ نے تیز آواز میں کہا اور اچھن بغیر کچھ جواب دیے اٹھی اور دیا سلائی کی ڈبیا لے کر دالان میں رینگ گئی۔

گھر کی سنسان تاریکی میں دیا سلائی کے رگڑنے کی آواز گونجی اور سیاہ طاق میں رکھے ہوئے چراغ پر مدھم سی لو چمکنے لگی .... بوسیدہ دالان کے ستون کا سایہ چھوٹے سے آنگن سے گزر کر سامنے کی دیوار تک چڑھ گیا تو اچھن نے دیا سلائی کی ڈبیا مٹھی میں دبا کر اپنا سر طاق کے برابر ٹیک دیا اور پتلیاں پھرا کر چراغ کی ٹمٹماتی ہوئی لو کو دیکھنے لگی۔

باپ نے بیڑی چارپائی کی پٹی پر رگڑ کر بجھا دی اور اسے دوبارہ پینے کے خیال سے اپنے کان پر جما کر اچھن کی طرف دیکھا تو اسے جیسے دھچکا سا لگا۔ اندھیرے میں پناہ ڈھونڈتی ہوئی روشنی میں وہ اس طرح کھڑی ہوئی بڑی بھیانک لگ رہی تھی ہڈیوں پر منڈھی ہوئی سیاہ کھال الجھے الجھائے جھونجھ ایسے بال، کھلے ہوئے ہونٹ اور پھری ہوئی پتلیاں .... بس جیسے وہ دیوار سے ٹک کر مر گئی ہو۔

ابھی دو سرا ہی سال تو تھا کہ باپ نے اچھن کی ماں کو بالکل اسی حالت میں بستر پر پڑے دیکھا تھا۔ کھلے ہوئے ہونٹ اور پھری پتلیاں .... یہ دیکھ کر وہ بجائے رونے دھونے کے گزوں نئے کپڑے کے پھیر میں پڑ گیا تھا۔ چیتھڑوں گدڑوں پر پڑا ہوا غریب عورت کا بے جان جسم .... اسے دنیا کے قاعدے کے بموجب کفن چاہیے تھا۔ گزوں نیا، تھان پر سے اُتارا ہوا کپڑا .... چاہے وہ زندگی میں ایک عرصے سے چھالیٹن کے ایک گھیر کھار والے پاجامے کو ترستی ہی رہی ہو مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟ .... غریبوں کو امیروں کی برابری کرنے کا بس ایک ہی موقع ملتا ہے دنیا میں اور وہ مرنے کے بعد صرف کفن لینے کے بارے میں۔ آہا! اصل بات تو یہ ہے کہ غریب پیدا ہی اس لیے ہوتے ہیں کہ مرنے کے بعد امیروں کی برابری کر لیں .... تو اچھن کی ماں کے لیے کفن چاہیے تھا اور اس کے لیے اچھن کا باپ انتہائی فکر مند تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اچھن کی ماں زندگی میں ہر ایک کے سامنے لیرے لیرے کپڑوں میں پھری تھی۔ اس کا یہ مطلب تھوڑی تھا کہ وہ قبر میں بھی یوں رکھ دی جاتی اس لیے اس نے جان پہچان والوں کے دروازے کھٹکھائے۔

ادھر اُدھر بہت دوڑا بے چارہ لیکن کہیں سے بھی اتنے روپے کا انتظام نہ ہو سکا کہ کفن خریدا جا سکتا۔ انتظام ہوتا بھی کیسے؟ اس کی جان پہچان والے ہی کون سے دو وقت پیٹ بھر کھانے والوں میں سے تھے؟ آخر وہ سب کی طرف سے مایوس ہو کر اپنے مالک کے پاس گیا۔ جن کی دکان پر وہ دس روپے مہینے کے عوض صبح سے شام تک حساب کتاب لکھا کرتا تھا۔

اس نے اپنی اُلجھی ہوئی میلی ڈاڑھی کو آنسوؤں سے بھگو کر ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا کہ مالک! میرے گھر میں بے کفن کی لاش پڑی ہے کچھ قرض............ اور مالک نے بات کاٹ کر نرم لہجے میں جواب دیا۔ ''منشی جی! یہ اللہ کے گھر کا کام ہے، قرض نہیں لو۔ یہ روپے، ادا کرنے کی فکر نہ کرنا'' تاجر مالک نے پچیس روپے اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

روٹیوں کو ترستی، کپڑے کو بلکتی اور حکیم صاحب کا نسخہ پینے کو سسکتی ہوئی اچھن کی ماں ایک دم پچیس روپے کا خرچ کروا کے زمین میں جا چھپی............

''اور اب............ اب اچھن''............ باپ فکر مند آنکھوں سے اچھن کو تک رہا تھا جو اب تک بے حس و حرکت دیوار سے سر ٹیکے چراغ کی مدھم لو کو پتلیاں پھرائے تکے جا رہی تھی۔

ماں کے مرنے کے بعد سے اسے بھی نہ جانے کیا ہوتا جا رہا تھا۔ بس گھلتی ہی چلی جا رہی تھی۔ وہی ماں کی سی ٹھسکے دار کھانسی اور ہلکا ہلکا بخار............ اِدھر پڑی ہے، اُدھر پڑی ہے۔ باپ غریب اس کی حالت کو سمجھتا تو خوب مگر وہ علاج کیا خاک کرتا۔ زیادہ سے زیادہ وہی خیراتی ہسپتال کی دوائیں، جن میں دوا تو برائے نام تھی ہاں پانی ہی پانی ہوتا............ سرکاری ہسپتال میں دی جانے والی دوائیں الٹا نقصان ہی کرتیں............ وہ جب اچھن کی ماں کے لیے کچھ نہ کر سکا تو اچھن کے لیے کہاں سے ڈاکٹر پکڑ لاتا............ پہلے بھی دس روپے پاتا تھا اور اب بھی۔ ہاں روپے کی قیمت بازار میں پہلے سے کہیں زیادہ گھٹ گئی تھی۔ جب اچھن کی ماں مری تھی تو بازار میں آٹا چار سیر روپے کا مل جاتا تھا اور اب ڈھائی روپے سیر بھی مشکل سے ملتا۔ ہر چیز مہنگائی کی انتہا کو پہنچ چکی تھی لیکن دکان کا پرانا منشی اتنا ہی سستا تھا جتنا بیس سال پہلے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے لڑائی شروع ہونے سے قبل جو چیزیں دو پیسے کو لے کر دکان میں بھری گئی تھیں وہ لڑائی شروع ہوتے ہی مہنگی ہوتی گئیں یہاں تک کہ دو پیسے کی چیز نے آٹھ دس گنا نفع دیا، گویا چیزیں جیسے جیسے پرانی ہوتی گئیں ویسے ویسے قیمتی بھی لیکن اس پرانے منشی کے دس روپے کی قیمت بازار میں گھٹتی ہی چلی گئی............ دکان میں ہن برس رہا تھا۔ مالک کے نام پر بینک میں سونے چاندی کے پہاڑ کھڑے ہو رہے تھے تو اسے کیا۔ وہی مثل کہ بی بی عید آئی۔ جواب ملا۔ دور موئی تجھے اپنی ٹکیا روٹی سے مطلب............ اسے تو جیسے اپنے دس روپوں کے سائے میں بٹھا دیا گیا تھا۔ جہاں ضروریات زندگی کی قیمتوں کا دائرہ روز بروز تنگ ہی ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے سنا کہ مل مزدوروں نے مہنگائی بھتہ لینا شروع کر دیا۔ کسانوں کی بن آئی۔ معمولی دکانوں کے ملازموں کی تنخواہوں میں بھی اضافہ ہو گیا اور یہاں تک کہ بوجھ اٹھانے والوں نے بھی اپنی مزدوری بڑھا دی تو اس کے دل میں بھی امنگ اٹھی کہ مالک سے صاف کہہ دے کہ میری تنخواہ بڑھاؤ............

لیکن شاید مالک نے اس کا خیال بھانپ کر پہلے ہی سے ہر وقت سنانا شروع کر دیا کہ منشی جی بڑھاپے سے تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اب گھر بیٹھو نوکری چھوڑ کر۔ یہ دیکھو تم نے حساب میں اتنی اتنی رقم ابھی تک نہیں جوڑی مجھے منشیوں کی کمی نہیں۔ میں تو تمہارے

پرانے ہونے کا خیال کرتا ہوں۔ سمجھے............ ''آئے دن یہ سن سن کر اس کا جی سوکھتا کہ کہیں ان دس روپوں کے بھی لالے نہ پڑ جائیں اور وہ اس دن کو کوستا جب اس کے دل میں تنخواہ بڑھوانے کا منحوس خیال آیا تھا............ اچھن سوکھتی جارہی تھی، اس کے لیے وہ انتہائی فکر مند تھا۔ پاس پڑوس والے کہتے کہ منشی جی! جب لونڈیا کو کھلا پہنا نہیں سکتے بیمار ہے تو کوڑی کی دوا نہیں دے سکتے تو اسے اپنے گھر بار کا کردو............ کھائے پہنے گی تو آپ ہی اچھی ہو جاوے گی۔ لیکن مشورہ دینے والے جیسے یہ سوچتے ہی نہ تھے کہ غریب کی لڑکی غریب ہی کے گھر جائے گی، کسی دس بارہ روپے پانے والے کی عورت کیا پہنے گی اور کیا کھائے گی۔ آخر اچھن کی ماں بھی تو شوہر والی تھی کون سا سکھ اُٹھالیا غریب نے؟

اچھن کو اس قدر عجیب طریقے سے کھڑے دیکھ کر باپ کی طبیعت الجھتی ہی چلی جارہی تھی............ اچانک اسے خیال آیا کہ کہیں وہ اس کے بیڑی پینے کے بارے میں تو اتنی رنجیدہ نہیں ہوگئی۔

''اچھن! اس طرح کیوں کھڑی ہے؟ اب میں بیڑی نہیں پیوں گا۔''

''کچھ نہیں ابا''............ اس نے دیوار سے سر اٹھا کر غور سے باپ کی طرف دیکھا۔ ''میں سوچ رہی تھی کہ چراغ کی لو بڑھا دوں ذرا۔'' اس کے لہجے میں بڑی آرزو اور خوشامد تھی۔

لیکن یہ سن کر باپ پر سے جیسے بھاری بوجھ ہٹ گیا۔ اتنی معمولی سی بات تھی جس کے لیے وہ اتنی دیر سے یوں کھڑی تھی۔ اس نے سوچا سچ مچ اچھن کا دماغ چل گیا ہے۔ اندھیرے کو روشنی میں تبدیل کرنے کا خیال اس کے نزدیک پاگل پن تھا۔ مگر آخر کیوں؟ اس نے کہا۔

''جانتی ہے کہ اٹھواروں میں کہیں دو پیسے کا مٹی کا تیل نصیب ہوتا ہے اس پر بھی بھیڑ بھاڑ میں پیروں کا قیمہ بنتا ہے، کپڑے پھٹتے ہیں............ کب سے کہہ رہا ہوں کہ تیل پر کنٹرول ہے اور تُو ہے کہ روز روز لو بڑھانے کی ضد کیا کرتی ہے۔''

''تو کیا فائدہ ایسے اُجالے سے۔ دکاندار اتنا تیل بھی نہ دیا کرے۔ اس سے تو اندھیرا پڑا رہے۔ نام تو نہ ہو چراغ جلنے کا۔'' اس کی آنکھوں میں چمکتی ہوئی آرزو کے ننھے ننھے دیے اچانک بجھ گئے۔

''فائدہ وائدہ کچھ نہیں معلوم مجھے۔ بس اتنا ہی تیل ملے گا کہ چراغ جلتا رہے۔'' باپ کی آواز تیز ہوگئی جیسے اس احساس نے اسے غصہ دلا دیا ہو۔

''چاہے روشنی نہ ہو۔'' اس کے ہونٹ پھڑک اٹھے۔

''ہاں۔'' باپ کا جواب گھر کی سنسان نیم تاریکی کو اور بھی تاریک کر گیا۔

''میرا تو جی الٹتا ہے ایسے اجالے سے۔'' اس نے مردہ سی آواز میں کہا لیکن باپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جیسے وہ بیٹی کے بات بات میں جی گھبرانے سے ناراض ہو گیا ہو............

وہ مایوس ہو کر لڑکھڑاتی ہوئی دالان سے نکل آئی اور اپنی چارپائی پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ اسے اپنے ابا پر غصہ آ رہا تھا کہ آخر وہ اس برائے نام روشنی پر قناعت کیوں کرتے ہیں؟ مٹی کا تیل اسے روزانہ کیوں نہیں ملتا؟ جب کہ گلی کے نکڑ والے خوبصورت دو منزلہ گھر میں تمام رات بڑی بڑی لالٹینوں کی روشنی ہوتی رہتی ہے.......... لیکن اس کا جھنجلایا ہوا دماغ یہ سوچ ہی نہ سکا کہ اگر تیل لڑے بھڑے ملنے بھی لگے تو اس مد کے لیے دو پیسے روز کس کے گھر سے آئیں گے جب کہ اس کے باپ کو سخت محنت کی قیمت صرف اتنی ہی ملتی ہے کہ وہ جیے تو کیا ہاں جینے کی بھونڈی سی نقل اتارتا رہے۔ بالکل اس طرح جیسے سیاہ طاق میں رکھا ہوا چراغ.......... جس کی مدھم روشنی پر چاروں طرف سے اندھیرا امنڈ رہا تھا..........

اچھن پیچ و تاب کھاتی اپنی چارپائی پر لڑھک گئی۔ اس کا جی گھبرا رہا تھا اور ہر طرف سے سفید نئے کپڑوں کی کھڑکھڑاہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ زور زور سے رو کر اپنے ابا کی قناعت پسندی کا ڈھنڈورا پیٹے.......... لیکن اس سے رویا بھی نہ گیا۔ آنسوؤں کا ذخیرہ تو جیسے حلق میں ہی پھنس کر رہ گیا تھا۔

(سب افسانے میرے)

مشق

1- افسانہ ''چراغ کی لو'' کا متن مدنظر رکھتے ہوئے درج ذیل سوالات کے مختصر جواب لکھیں:

i- اچھن کس بیماری میں مبتلا تھی؟

ii- اچھن کا باپ کیا کام کرتا تھا؟

iii- دکان کے مالک نے منشی جی کو روپے کیوں دے دیے؟

iv- اچھن کے لہجے میں کس بات کی آرزو اور خوشامد تھی؟

v- اچھن کے ابا نے یہ کیوں کہا کہ میں بیڑی نہیں پیوں گا؟

vi- اس افسانے میں ہمارے کس معاشرتی رویے پر تنقید کی گئی ہے؟

2- افسانہ ''چراغ کی لو'' کا مرکزی خیال تحریر کریں۔

3- افسانہ ''چراغ کی لو'' کا خلاصہ لکھیں۔

4- ''سرمایۂ اردو'' میں شامل افسانوں میں سے آپ کو کون سا افسانہ اچھا لگا اور کیوں؟ اپنے ٹیوٹوریل پیریڈ میں وضاحت کریں۔

مرزا اسداللہ خاں غالب

(1797ء-1869ء)

مکتوباتِ غالب

بنام میر مہدی حسین مجروح

سید صاحب

نہ تم مجرم، نہ میں گنہ گار۔ تم مجبور، میں ناچار۔ لو اب کہانی سنو، میری سرگزشت میری زبانی سنو۔ نواب مصطفیٰ خاں بہ میعاد سات برس کے قید ہو گئے تھے، سو ان کی تقصیر معاف ہوئی اور ان کو رہائی ملی۔ صرف رہائی کا حکم آیا ہے۔ جہانگیر آباد کی زمینداری اور دلی کی املاک اور پنسن کے باب میں ہنوز کچھ حکم نہیں ہوا۔ ناچار وہ رہا ہو کر میرٹھ ہی میں ایک دوست کے مکان میں ٹھہرتے ہیں۔ بہ مجرد استماع اس خبر کے، ڈاک میں بیٹھ کر میرٹھ گیا۔ اُن کو دیکھا۔ چار دن وہاں رہا، پھر ڈاک میں اپنے گھر آیا۔ تاریخ آنے جانے کی یاد نہیں، مگر ہفتہ کو گیا، منگل کو آیا۔ آج بدھ دوم فروری ہے۔ مجھ کو آئے ہوئے نواں دن ہے۔[1] انتظار میں تھا کہ تمھارا خط آئے تو اس کا جواب لکھا جائے۔ آج صبح کو تمھارا خط آیا۔ دوپہر کو میں جواب لکھتا ہوں:

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہوتا ہے

میرٹھ سے آ کر دیکھا کہ یہاں بڑی شدت ہے اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں ہے۔ لاہوری دروازے کا تھانے دار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھتا ہے جو باہر سے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے، اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے ہاں سے پانچ پانچ بید لگتے ہیں یا دو روپے جرمانہ لیا جاتا ہے۔ آٹھ دن قید رہتا ہے۔ اس سے علاوہ سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو، کون بے ٹکٹ مقیم ہے اور کون ٹکٹ رکھتا ہے۔ تھانوں میں نقشے مرتب ہونے لگے۔ یہاں کا جمعدار میرے پاس بھی آیا۔ میں نے کہا: بھائی، تو مجھے نقشے میں نہ رکھ، میری کیفیت کی عبارت الگ لکھ۔ عبارت یہ کہ اسد اللہ خاں پنسن دار ۱۸۵۰ء سے حکیم پٹیالے والے کے بھائی کی حویلی میں رہتا ہے۔ نہ کالوں کے وقت میں کہیں گیا، نہ گوروں کے زمانے میں نکلا اور نہ نکالا گیا۔ کرنل برون[2] صاحب بہادر کے زبانی حکم پر اس کی اقامت کا مدار ہے۔ اب تک کسی حاکم نے وہ حکم نہیں بدلا۔ اب حاکم وقت کو اختیار ہے۔ پرسوں یہ عبارت جمعدار نے محلے کے نقشے کے ساتھ کوتوالی بھیج دی۔ کل سے یہ حکم نکلا کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان و کان کیوں بناتے ہیں؟ جو مکان بن چکے ہیں انھیں ڈھا دو اور آئندہ کی ممانعت کا حکم سنا دو اور یہ بھی مشہور ہے کہ پانچ ہزار ٹکٹ چھاپے گئے ہیں جو مسلمان شہر میں اقامت چاہے، بقدر مقدور نذرانہ دے۔ اس کا اندازہ قرار دینا حاکم کی رائے پر ہے۔ روپیا دے اور ٹکٹ لے۔ گھر برباد ہو جائے، آپ شہر میں آباد

---

[1] گویا ۲۲۔ جنوری کو میرٹھ گئے اور ۲۵ جنوری کو لوٹے۔

[2] اس کا نام برون نہیں برن (Burn) تھا۔ وہ فتح دہلی کے بعد شہر کا فوجی گورنر مقرر ہوا تھا۔

ہوجائے۔ آج تک یہ صورت ہے، دیکھیے شہر کے بسنے کی کون مہورت ہے؟ جو رہتے ہیں وہ بھی اخراج کیے جاتے ہیں یا جو باہر پڑے ہوئے ہیں، وہ شہر میں آتے ہیں؟ الملک لِلّٰہ والحکم لِلّٰہ۔

نورچشم میر سرفراز حسین اور برخوردار میر نصیر الدین کو دعا اور جناب میرن صاحب کو سلام بھی اور دعا بھی۔ اس میں سے جو چاہیں قبول کرلیں۔

بدھ ۲۔ فروری (۱۸۵۹ء) غالب

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ

بھائی!

تم سچ کہتے ہو کہ بہت مسوّدے اصلاح کے واسطے فراہم ہوئے ہیں، مگر یہ نہ سمجھنا کہ تمھارے ہی قصائد پڑے ہیں۔ نواب صاحب کی غزلیں بھی اسی طرح دھری ہوئی ہیں۔ برسات کا حال تمھیں بھی معلوم ہے اور یہ بھی تم جانتے ہو کہ میرا مکان گھر کا نہیں ہے، کرایے کی حویلی میں رہتا ہوں۔ جولائی سے مینہ شروع ہوا۔ شہر میں سیکڑوں مکان گرے اور مینہ کی نئی صورت، دن رات میں دو چار بار برسے اور ہر بار اس زور سے کہ ندی نالے بہ نکلیں۔ بالا خانے کا جو دالان میرے اُٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، جینے مرنے کا محل ہے، اگرچہ گرا نہیں لیکن چھت چھلنی ہوگئی۔ کہیں لگن، کہیں چلمچی، کہیں اُگالدان رکھ دیا۔ قلمدان، کتابیں اٹھا کر توشے خانے کی کوٹھڑی میں رکھ دیے۔ مالک مرمت کی طرف متوجہ نہیں۔ کشتیِ نوح میں تین مہینے رہنے کا اتفاق ہوا۔ اب نجات ہوئی ہے۔ نواب صاحب کی غزلیں اور تمھارے قصائد دیکھے جائیں گے۔

میر بادشاہ میرے پاس آئے تھے۔ تمھاری خیر و عافیت ان سے معلوم ہوئی تھی۔ میر قاسم علی صاحب مجھ سے نہیں ملے۔ پرسوں سے نواب مصطفیٰ خاں صاحب یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ایک ملاقات ان سے ہوئی ہے۔ ابھی یہیں رہیں گے، بیمار ہیں، احسن اللہ خاں معالج ہیں، فصد ہوچکی ہے، جونکیں لگ چکی ہیں، اب مسہل کی فکر ہے، سوا اس کے سب طرح کی خیر و عافیت ہے۔ میں ناتواں بہت ہوگیا ہوں، گویا صاحب فراش ہوں۔ کوئی شخص نیا تکلف کی ملاقات کا آجائے تو اٹھ بیٹھتا ہوں، ورنہ پڑا رہتا ہوں۔ لیٹے لیٹے خط لکھتا ہوں، لیٹے لیٹے مسوّدات دیکھتا ہوں۔ اللہ اللہ!

صبح جمعہ ۱۴ ماہِ اکتوبر ۱۸۶۴ء غالب

(خطوطِ غالب مرتبہ مولانا غلام رسول مہر)

مشق

1- مکاتیبِ غالب پیشِ نظر رکھتے ہوئے درج ذیل سوالات کے درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگائیں۔

i- نواب مصطفیٰ خاں رہا ہو کر کس شہر میں گئے؟

ا۔ دہلی　　ب۔ لکھنو

ج۔ بنارس　　د۔ میرٹھ

ii- بقول غالب جنوری 1859ء میں شہر میں بلا ٹکٹ داخل ہونے پر حاکم سے سزا ملتی تھی:

ا۔ آٹھ دن قید　　ب۔ دس دن قید

ج۔ بارہ دن قید　　د۔ چودہ دن قید

iii- حاکمِ وقت نے حکم دیا:

ا۔ شہر کے مکان ڈھانے کا

ب۔ شہر سے باہر والے مکان ڈھانے کا

ج۔ شہر سے باہر مکان ڈھانے اور آئندہ ممانعت کا

iv- ہرگوپال تفتہ نے برائے اصلاح غالب کو کیا بھیجا تھا؟

ا۔ غزلیں　　ب۔ نظمیں

ج۔ قصائد　　د۔ مثنویاں

v- بقول غالب صاحبِ فراش ہوتے ہوئے وہ مسوّدات کس طرح دیکھتے تھے؟

ا۔ لیٹے لیٹے　　ب۔ چلتے پھرتے

ج۔ کھڑے کھڑے　　د۔ بیٹھے بیٹھے

2- ''مکاتیبِ غالب'' کا متن پیشِ نظر رکھتے ہوئے درج ذیل سوالات کے مختصر جواب تحریر کریں جو تین تین سطور سے زیادہ نہ ہوں۔

i- غالب نے میرٹھ کا سفر کیسے طے کیا؟

ii- نواب مصطفیٰ خاں دوست کے ہاں کیوں ٹھہرے؟

iii- 1859ء میں حکمِ حاکم کی بابت غالب نے اپنے شعر میں کیا کہا ہے؟

iv- ہرگوپال تفتہ کے نام خط میں مذکورہ تلمیح کی وضاحت کریں۔

3- مندرجہ ذیل الفاظ کے معانی لکھیں اور جملوں میں استعمال کریں۔

سرگزشت، اقامت، فصد، مسہل، مسودات۔

علامہ اقبالؒ

(1877ء-1938ء)

مکتوباتِ اقبالؒ

مولانا گرامی کے نام

جناب مولانا گرامی!

میں ابھی تک علیل ہوں، گو پہلے کی نسبت بہت افاقہ ہے۔ دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ کامل صحت عطا فرمائے۔ حکیم اجمل خاں صاحب نے دہلی سے دوا بھیجی تھی مگر اس سے بھی بہت کم فائدہ ہوا۔ کل گورداس پور سے ایک حکیم صاحب خود بخود تشریف لے آئے تھے۔ انھیں کسی سے میری علالت کا حال معلوم ہوا تھا۔ دوا دے گئے ہیں جس سے فائدہ معلوم ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس دوا سے فائدہ ہو جائے گا کیونکہ جن اجزا سے یہ مرکب ہے ان میں سے ایک اخلاص بھی ہے جو ان حکیم صاحب کو خود بخود میرے مکان تک لے آیا۔ بہر حال خدا تعالیٰ کے فضل کا منتظر ہوں۔

میاں ریاض صاحب[1] نے آپ کو لاہور کی دعوت دی اور انجمنِ حمایتِ اسلام لاہور نے دعوت دی۔ افسوس ہے آپ نے کسی کی دعوت قبول نہ کی۔ میری تو یہ رائے ہے کہ ضرور ان دونوں کی دعوتوں کو قبول فرمایئے۔

میں تو اپنے آپ کو اس درد کی وجہ سے رفتنی سمجھتا تھا مگر محض اس خیال سے تسکین تھی کہ پاؤں کا درد ہے۔ حرکت محال ہے، رفتنی نہیں آمدنی ہوں۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ ممکن ہو تو لاہور ضرور آیئے اور لوگوں کو اپنا تازہ کلام بھی سنایئے۔

کل بمبئی سے ایک عرب کا خط آیا ہے جو ''اسرار خودی'' کو عربی میں ترجمہ کرانا چاہتا ہے اور اس کی اجازت مانگتا ہے۔ میں نے اسے اجازت دے دی ہے۔

مخلص

محمد اقبال

---

1. میاں ریاض الدین صاحب، میاں سراج الدین تاجر کتب کشمیری بازار کے فرزند تھے۔ انھوں نے کوچہ کوٹھی داراں میں ایک حویلی بھی ''ریاض منزل'' کے نام سے تعمیر کی تھی جو بعد میں ملک لال دین قیصر نے خرید لی تھی۔ میاں ریاض الدین رئیسوں کی طرح رہتے تھے۔ نہایت کشادہ دست تھے۔ ان کا دستر خوان بڑا وسیع تھا۔ ان کے مکان پر اکثر ادب کی محفلیں برپا ہوتی تھیں جن میں مشاہیرِ ملک شرکت فرماتے تھے۔

اکبر الٰہ آبادی کے نام

لاہور ۱۴ ستمبر ۱۸ء

مخدومی! السلام علیکم

والا نامہ ابھی ملا۔ الحمد للہ کہ خیریت ہے۔ ابھی تو مسلمانوں کو اور ان کے لٹریچر کو آپ کی سخت ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو عمرِ خضر عطا فرمائے۔

میں 9 ستمبر کو لاہور واپس آ گیا تھا مگر ترشی کے زیادہ استعمال سے دانت میں سخت درد ہو گیا جس نے کئی روز تک بے قرار رکھا۔ اب خدا کے فضل سے بالکل اچھا ہوں۔ رسالہ ایسٹ اینڈ ویسٹ[1] (انگریزی) کے اگست کے نمبر میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب نے ایک ریویو[2] دونوں مثنویوں پر لکھا ہے۔ نہایت قابلیت سے لکھا ہے۔ اگر اس ریویو کی کوئی کاپی مل گئی تو ارسال خدمت کروں گا۔ آج ''زمانہ'' میں ایک ریویو نظر سے گزرا۔ ''زمانہ'' کے اسی نمبر میں آپ کے اشعار بھی دیکھے جن کو کئی دفعہ پڑھا ہے اور ابھی کئی بار پڑھوں گا۔ بالخصوص ایک نہایت مخلص نوجوان یہاں لاہور میں ہے، تاجرِ کُتب ہے اور مجھ سے کہتا ہے کہ ''شکوہ'' اور ''جواب شکوہ'' کو پھر شائع کرنا چاہیے مگر مولانا اکبر دیباچہ لکھیں۔ میں نے آپ کی طرف سے ہر چند عذر کیا مگر وہ مُصر ہے۔ آخر میں نے اس سے وعدہ کیا کہ مولانا کی خدمت میں عرض کروں گا۔ ایسی فرمایش کرتے ہوئے حجاب آتا ہے کہ مجھے آپ کے ضعف و ناتوانی کا حال معلوم ہے۔ تاہم اگر کسی روز طبیعت شگفتہ ہو اور آلام و افکار کا احساس، شگفتگی طبع سے کم ہو گیا ہو تو دس پندرہ سطور اس کی خاطر لکھ ڈالیے۔ یہ لڑکا آپ کا غائبانہ مرید ہے۔

کلکتہ کے فساد کے حالات اخبار میں پڑھے تھے آج مزید حالات پڑھے۔ خدا تعالیٰ مسلمانوں پر فضل کرے۔

مجھے بھی کلکتہ سے بلاوا آیا تھا اور میں جانے کو قریباً تیار بھی تھا مگر جب مطبوعہ خط کا مضمون والدِ مکرم کو سنایا تو انھوں نے فرمایا کہ حُکام غالباً یہ جلسہ بند کر دیں گے۔ بعد میں ایسا ہی ہوا۔

محمد اقبال

(کلیاتِ مکاتیبِ اقبالؒ مرتبہ سید مظفر حسین برنی)

مشق

1- درست جواب کے شروع میں ''✓'' کا نشان لگائیں۔

i- علامہ اقبالؒ نے پہلے خط میں مولانا گرامی کے لیے کیا القاب استعمال کیے؟

ا۔ جناب مولانا گرامی ب۔ حضرت مولانا گرامی ج۔ ڈیر مولانا گرامی

---

[1] East and West [2] Review۔تبصرہ

ii- علامہ اقبالؒ کیسا درد محسوس کرتے تھے؟

الف۔ سر کا درد　　　ب۔ پاؤں کا درد　　　ج۔ پسلی کا درد

iii- ''اسرارِ خودی'' کا عربی میں ترجمہ کون کرانا چاہتا تھا؟

الف۔ ایک عرب　　　ب۔ ایک ہندوستانی　　　ج۔ ایک انگریز

iv- فسادات کس شہر میں ہو رہے تھے؟

الف۔ دہلی میں　　　ب۔ لکھنؤ میں　　　ج۔ کلکتہ میں

v- میاں ریاض صاحب نے مولانا گرامی کو کہاں آنے کی دعوت دی؟

الف۔ سیالکوٹ　　　ب۔ لاہور　　　ج۔ کراچی

2- مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

i- علامہ اقبالؒ گورداس پور والے حکیم کی دوا سے مطمئن کیوں تھے؟

ii- پہلے خط میں علامہ اقبالؒ نے کن دعوتوں کا ذکر کیا ہے؟

iii- دوسرا خط کس شخصیت کے نام لکھا گیا ہے؟

iv- دوسرے خط میں علامہ اقبالؒ نے مکتوب الیہ سے کیا درخواست کی ہے؟

v- کس رسالے میں علامہ اقبالؒ کی دونوں مثنویوں پر رائے دی گئی؟

vi- علامہ اقبالؒ نے اکبرالہٰ آبادی کے اشعار کس رسالے میں پڑھے؟

vii- لاہور کی کس انجمن نے مولانا گرامی کو آنے کی دعوت دی؟

viii- علامہ اقبالؒ کو ایک عرب نے کس شہر سے خط لکھا؟

3- مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کریں۔

علیل۔ افاقہ۔ عمرِ خضر۔ ضعف و ناتوانی۔ میلانِ طبیعت۔

4- مندرجہ ذیل الفاظ کے واحد لکھیں۔

حکام۔حالات۔آلام۔افکار۔اشعار۔

5- سیاق و سباق کے حوالے سے مندرجہ ذیل پیراگراف کی تشریح کریں۔

میں ابھی تک علیل ہوں .... خدا تعالیٰ کے فضل کا منتظر ہوں۔

احمد شاہ بخاری پطرس
(1898ء-1958ء)

لاہور کا جغرافیہ

تمہید:

تمہید کے طور پر صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ لاہور کو دریافت ہوئے اب بہت عرصہ گزر چکا ہے، اس لیے دلائل و براہین سے اس کے وجود کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ کہنے کی بھی اب ضرورت نہیں کہ کرے کو دائیں سے بائیں گھمائیے، حتیٰ کہ ہمارا ملک آپ کے سامنے آ کر ٹھہر جائے، پھر فلاں طول البلد اور فلاں عرض البلد کے مقامِ انقطاع پر لاہور کا نام تلاش کیجیے، جہاں یہ نام کرے پر مرقوم ہو، وہی لاہور کا محلِ وقوع ہے۔ اس ساری تحقیقات کو مختصر مگر جامع الفاظ میں بزرگ یوں بیان کرتے ہیں کہ لاہور، لاہور ہی ہے۔ اگر اس پتے سے آپ کو لاہور نہیں مل سکتا تو آپ کی تعلیم ناقص اور آپ کی ذہانت فاتر ہے۔

محلِ وقوع:

ایک دو غلط فہمیاں البتہ ضرور رفع کرنا چاہتا ہوں۔ لاہور پنجاب میں واقع ہے لیکن پنجاب اب پنج آب نہیں رہا۔ اس پانچ دریاؤں کی سرزمین میں اب صرف ساڑھے چار دریا بہتے ہیں اور جو نصف دریا ہے وہ تو اب بہنے کے قابل ہی نہیں رہا۔ اس کو اصطلاح میں راوی ضعیف کہتے ہیں۔ ملنے کا پتا یہ ہے کہ شہر کے قریب دو پل بنے ہوئے ہیں۔ ان کے نیچے ریت میں یہ دریا لیٹا رہتا ہے، بہنے کا شغل عرصے سے بند ہے۔ اس لیے یہ بتانا بھی مشکل ہے کہ شہر دریا کے دائیں کنارے پر واقع ہے یا بائیں کنارے پر۔

لاہور تک پہنچنے کے کئی راستے ہیں لیکن دو ان میں سے بہت مشہور ہیں، ایک پشاور سے آتا ہے، دوسرا دہلی سے۔ وسطی ایشیا کے حملہ آور پشاور کے راستے اور یوپی کے حملہ آور دہلی کے راستے وارد ہوتے ہیں۔ اوّل الذکر اہلِ سیف کہلاتے ہیں اور غزنوی یا غوری تخلص کرتے ہیں۔ مؤخر الذکر اہلِ زبان کہلاتے ہیں۔ یہ بھی تخلص کرتے ہیں اور اس میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔

حدود اربعہ:

کہتے ہیں کسی زمانے میں لاہور کا حدود اربعہ بھی ہوا کرتا تھا لیکن طلبہ کی سہولت کے لیے میونسپلٹی نے اسے منسوخ کر دیا ہے۔ اب لاہور کے چاروں طرف بھی لاہور ہی واقع ہے اور روز بروز واقع تر ہو رہا ہے۔......... ماہرین کا اندازہ ہے کہ دس بیس سال کے اندر لاہور ایک صوبے کا نام ہوگا جس کا دار الخلافہ پنجاب ہوگا۔ یوں سمجھیے کہ لاہور ایک جسم ہے جس کے ہر حصے پر ورم نمودار ہو رہا ہے لیکن ہر ورم مواد فاسد سے بھرا ہے۔ گویا یہ توسیع ایک عارضہ ہے جو اس کے جسم کو لاحق ہے۔

آب و ہوا:

لاہور کی آب و ہوا کے متعلق طرح طرح کی روایات مشہور ہیں جو قریباً سب کی سب غلط ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لاہور کے

باشندوں نے حال ہی میں یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ اور شہروں کی طرح ہمیں بھی آب و ہوا دی جائے۔ میونسپلٹی بڑی بحث و تمحیص کے بعد اس نتیجے پر پہنچی کہ اس ترقی کے دور میں جبکہ دنیا میں کئی ممالک کو ہوم رُول مل رہا ہے اور لوگوں میں بیداری کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ اہلِ لاہور کی یہ خواہش ناجائز نہیں بلکہ ہمدردانہ غور و خوض کی مستحق ہے۔

لیکن بدقسمتی سے کمیٹی کے پاس ہوا کی قلت تھی۔ اس لیے لوگوں کو ہدایت کی گئی کہ مفادِ عامہ کے پیشِ نظر اہلِ شہر ہوا کا بے جا استعمال نہ کریں بلکہ جہاں تک ہو سکے کفایت شعاری سے کام لیں۔ چنانچہ اب لاہور میں عام ضروریات کے لیے ہوا کی بجائے گرد اور خاص خاص حالات میں دھواں استعمال کیا جاتا ہے۔ کمیٹی نے جا بجا دھوئیں اور گرد کے مہیا کرنے کے لیے مرکز کھول دیے ہیں جہاں یہ مرکبات مفت تقسیم کیے جاتے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ اس سے نہایت تسلی بخش نتائج برآمد ہوں گے۔

بہم رسانی آب کے لیے ایک اسکیم عرصے سے کمیٹی کے زیرِ غور ہے۔ یہ اسکیم نظام سقّے کے وقت سے چلی آتی ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ نظام سقّے کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے اہم مسودات بعض تو تلف ہو چکے ہیں اور جو باقی ہیں ان کے پڑھنے میں بہت دقت پیش آ رہی ہے۔ اس لیے ممکن ہے کہ تحقیق و تدقیق میں ابھی چند سال اور لگ جائیں۔ عارضی طور پر پانی کا یہ انتظام کیا گیا ہے کہ فی الحال بارش کے پانی کو حتی الوسع شہر سے باہر نکلنے نہیں دیتے، اس میں کمیٹی کو بہت کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ تھوڑے ہی عرصے میں ہر محلّے کا اپنا ایک دریا ہو گا جس میں رفتہ رفتہ مچھلیاں پیدا ہوں گی اور ہر مچھلی کے پیٹ میں کمیٹی کی ایک انگوٹھی ہو گی جو رائے دہندگی کے موقعے پر ہر رائے دہندہ پہن کر آئے گا۔

نظام سقّے کے مسودات سے اس قدر ضرور ثابت ہوا ہے کہ پانی پہنچانے کے لیے نل ضروری ہیں۔ چنانچہ کمیٹی نے کروڑوں روپے خرچ کر کے جا بجا نل لگوا دیے ہیں۔ فی الحال ان میں ہائیڈروجن اور آکسیجن بھری ہے لیکن ماہرین کی رائے ہے کہ ایک نہ ایک دن یہ گیسیں ضرور مل کر پانی بن جائیں گی۔ چنانچہ بعض نلوں میں اب بھی چند قطرے روزانہ ٹپکتے ہیں۔ اہلِ شہر کو ہدایت کی گئی ہے کہ اپنے اپنے گھڑے نلوں کے نیچے رکھ چھوڑیں تاکہ عین وقت پر تاخیر کی وجہ سے کسی کی دل شکنی نہ ہو۔ شہر کے لوگ اس پر بہت خوشیاں منا رہے ہیں۔

ذرائع آمد و رفت:

جو سیاح لاہور تشریف لانے کا ارادہ رکھتے ہوں ان کو یہاں کے آمد و رفت کے ذرائع کے متعلق چند ضروری باتیں ذہن نشین کر لینی چاہییں تاکہ وہ یہاں کی سیاحت سے کماحقہٗ اثر پذیر ہو سکیں۔ جو سڑک بل کھاتی ہوئی لاہور کے بازاروں میں سے گزرتی ہے، تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ یہ وہی سڑک ہے جو شیر شاہ سوری نے بنوائی تھی۔ یہ آثارِ قدیمہ میں شمار ہوتی ہے اور بے حد احترام کی نظروں سے دیکھی جاتی ہے۔ چنانچہ اس میں کسی قسم کا ردّ و بدل گوارا نہیں کیا جاتا۔ وہ قدیم تاریخی گڑھے اور خندقیں جوں کی توں موجود ہیں جنھوں نے کئی سلطنتوں کے تختے الٹ دیے تھے۔ آج کل بھی کئی لوگوں کے تختے یہاں الٹتے ہیں اور عظمتِ رفتہ کی یاد دلا کر انسان کو عبرت سکھاتے ہیں۔

بعض لوگ زیادہ عبرت پکڑنے کے لیے ان تختوں کے نیچے کہیں کہیں دو ایک پہیے لگا لیتے ہیں اور سامنے دو ٹک لگا کر ان میں ایک گھوڑا اٹانگ دیتے ہیں۔ اصطلاح میں اس کو تانگا کہتے ہیں۔ شوقین لوگ اس تختے پر موم جامہ منڈھ لیتے ہیں تاکہ پھسلنے میں سہولت ہو اور بہت زیادہ عبرت پکڑی جا سکے۔

تانگوں میں بناسپتی گھوڑے استعمال کیے جاتے ہیں۔ بناسپتی گھوڑا شکل صورت میں دُم دار ستارے سے ملتا ہے کیوں کہ اس گھوڑے کی ساخت میں دُم زیادہ اور گھوڑا کم پایا جاتا ہے۔ حرکت کے وقت اپنی دُم دبا لیتا ہے اور ضبطِ نفس سے اپنی رفتار میں ایک سنجیدہ اعتدال پیدا کرتا ہے تاکہ سڑک کا ہر تاریخی گڑھا اور تانگے کا ہر ہچکولا اپنا نقش آپ پر ثبت کرتا جائے اور آپ کا ہر ایک مسام لطف اندوز ہو سکے۔

قابلِ دید مقامات:

لاہور میں قابلِ دید مقامات مشکل سے ملتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لاہور کی ہر عمارت کی بیرونی دیواریں دُہری بنائی جاتی ہیں۔ پہلے اینٹوں اور چونے سے دیوار کھڑی کرتے ہیں اور پھر اس پر اشتہاروں کا پلستر کر دیا جاتا ہے جو دبازت میں رفتہ رفتہ بڑھتا جاتا ہے۔ شروع شروع میں چھوٹے سائز کے مبہم اور غیر معروف اشتہارات چپکا دیے جاتے ہیں، مثلاً ''اہلِ لاہور کو مژدہ'' یا ''اچھا سستا مال۔'' اس کے بعد ان اشتہاروں کی باری آتی ہے جن کے مخاطب اہلِ علم اور سخن فہم لوگ ہوتے ہیں مثلاً ''گریجویٹ درزی ہاؤس یا ''سٹوڈنٹس کے لیے نادر موقع'' یا ''کہتی ہے ہم کو خلقِ خدا غائبانہ کیا'' رفتہ رفتہ گھر کی چار دیواری مکمل ڈائرکٹری کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ دروازے کے اوپر بوٹ پالش کا اشتہار ہے، دائیں طرف تازہ مکھن ملنے کا پتا درج ہے، بائیں طرف حافظہ کی گولیوں کا بیان ہے، اس کھڑکی کے اوپر ''انجمن خُدّامِ ملّت'' کے جلسے کا پروگرام چسپاں ہے۔ عقبی دیوار پر سرکس کے تمام جانوروں کی فہرست ہے۔ یہ اشتہارات بڑی سرعت سے بدلتے رہتے ہیں اور ہر نیا مژدہ اور ہر نئی دریافت یا ایجاد یا انقلابِ عظیم کی ابتدا چشمِ زدن میں ہر ساکن چیز پر لیپ دی جاتی ہے اور ان کو پہچاننے میں خود شہر کے لوگوں کو بڑی دقت پیش آتی ہے۔

لیکن جب سے لاہور میں دستور رائج ہوا ہے کہ بعض بعض اشتہاری کلمات پختہ سیاہی سے خود دیواروں پر نقش کر دیے جاتے ہیں، یہ دِقت بہت حد تک رفع ہو گئی ہے۔ ان دائمی اشتہاروں کی بدولت اب یہ خدشہ باقی نہیں رہا کہ کوئی شخص اپنا یا اپنے دوست کا مکان صرف اس لیے بھول جائے کہ پچھلی مرتبہ وہاں چارپائیوں کا اشتہار لگا ہوا تھا اور لوٹتے وقت تک اہلِ لاہور کو تازہ اور سستے جوتوں کا مژدہ سنایا جا رہا ہے۔ چنانچہ اب وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ جہاں بحرفِ جلی ''محمد علی دندان ساز'' لکھا ہے وہ اخبار انقلاب کا دفتر ہے۔ ''خالص گھی کی مٹھائی'' امتیاز علی تاج صاحب کا مکان ہے ''کرشنا بیوٹی کریم'' شالامار باغ کو اور ''کھانسی کا مجرب نسخہ'' جہانگیر کے مقبرے کو جاتا ہے۔

صنعت و حرفت:

اشتہاروں کے علاوہ لاہور کی سب سے بڑی صنعت رسالہ سازی ہے اور سب سے بڑی حرفت انجمن سازی ہے۔ ہر رسالے کا نمبر عموماً خاص نمبر ہوتا ہے اور عام نمبر صرف خاص خاص موقعوں پر شائع کیے جاتے ہیں۔

لاہور کے ہر مربع انچ میں ایک انجمن موجود ہے، پریذیڈنٹ البتہ تھوڑے ہیں۔ اس لیے فی الحال صرف دو تین اصحاب ہی یہ اہم فرض ادا کر رہے ہیں۔ چونکہ ان انجمنوں کے اغراض و مقاصد مختلف نہیں اس لیے بسا اوقات ایک ہی صدر صبح کسی مذہبی کانفرنس کا افتتاح کرتا ہے اور شام کو کسی کرکٹ ٹیم کے ڈنر میں شامل ہوتا ہے۔ اس سے ان کا مطمحِ نظر وسیع رہتا ہے۔ تقریر عام طور پر ایسی ہوتی ہے جو دونوں موقعوں پر کام آسکتی ہے۔ چنانچہ سامعین کو بہت سہولت رہتی ہے۔

پیداوار:

لاہور کی سب سے مشہور پیداوار یہاں کے طلبہ ہیں جو بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں دساور کو بھیجے جاتے ہیں۔ فصل شروع سرما میں بوئی جاتی ہے اور عموماً اواخر بہار میں پک کر تیار ہوتی ہے۔

طلبہ کی کئی قسمیں ہوتی ہیں جن میں سے چند مشہور ہیں۔ قسم اول جمالی کہلاتی ہے۔ یہ طلبہ عام طور پر پہلے درزیوں کے ہاں تیار ہوتے ہیں، بعدازاں دھوبی اور پھر نائی کے پاس بھیجے جاتے ہیں اور اس عمل کے بعد کسی ریستوران میں ان کی نمائش کی جاتی ہے۔

دوسری قسم جلالی طلبہ کی ہے۔ ان کا شجرہ جلال الدین اکبر سے ملتا ہے، اس لیے ہندوستان کا تخت و تاج ان کی ملکیت سمجھا جاتا ہے۔ شام کے وقت چند مصاحبوں کو ساتھ لیے نکلتے ہیں اور جودوسخا کے خم لنڈھاتے پھرتے ہیں۔ کالج کی خوراک انھیں راس نہیں آتی، اس لیے ہوسٹل میں فروکش نہیں ہوتے۔

تیسری قسم خیالی طلبہ کی ہے۔ یہ اکثر روپ، اخلاق اور آواگون اور جمہوریت پر بآوازِ بلند تبادلہ خیالات کرتے پائے جاتے ہیں اور آفرینش اور نفسیات کے متعلق نئے نئے نظریے پیش کرتے رہتے ہیں۔ صحتِ جسمانی کو ارتقائے انسانی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ اس لیے علی الصّباح پانچ چھے ڈنٹر پیلتے ہیں اور شام کو ہوسٹل کی چھت پر گہرے سانس لیتے ہیں۔ گاتے ضرور ہیں لیکن اکثر بے سرے ہوتے ہیں۔

چوتھی قسم خالی طلبہ کی ہے۔ یہ طلبہ کی خالص ترین قسم ہے۔ ان کا دامن کسی قسم کی آلائش سے تر ہونے نہیں پاتا۔ کتابیں، امتحانات، مطالعہ اور اسی قسم کے خرخشے کبھی ان کی زندگی میں خلل انداز نہیں ہوتے۔ جس معصومیت کو لے کر وہ کالج میں پہنچے تھے، اسے آخر تک ملوث نہیں ہونے دیتے اور تعلیم اور نصاب اور درس کے ہنگاموں میں اس طرح زندگی بسر کرتے ہیں جس طرح بتیس دانتوں میں زبان رہتی ہے۔

طبعی حالات:

لاہور کے لوگ بہت خوش طبع ہیں۔

(پطرس کے مضامین)

مشق

1- مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب لکھیں:

i- میونسپلٹی نے ہوا کی قلت دور کرنے کے لیے کیا اقدامات کیے ہیں؟

ii- لاہور میں بہم رسانی آب کے منصوبے کی تکمیل میں تاخیر کیوں ہو رہی ہے؟

iii- میونسپلٹی نے جابجا ئل لگا کر اہل لاہور کو کیا ہدایت کی ہے؟

iv- لاہور کے بازاروں میں سے گزرنے والی سڑک کس نے بنوائی تھی؟

v- تانگے کی ساخت مصنف کے الفاظ میں بیان کریں۔

vi- ”لاہور کی ہر عمارت کی بیرونی دیواریں دُہری بنائی جاتی ہیں“۔ وضاحت کریں۔

vii- پختہ سیاہی کے اشتہارات کا فوری فائدہ کیا ہوا ہے؟

viii- لاہور کی مشہور ترین پیداوار کیا ہے؟

ix- طلبہ کی کتنی قسمیں ہوتی ہیں؟ صرف نام لکھیں۔

x- طبعی حالات کے عنوان کے تحت اہلِ لاہور کی کس صفت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے؟

2- سبق کی مدد سے موزوں الفاظ کا انتخاب کر کے خالی جگہ پُر کیجیے:

i- لاہور تک پہنچنے کے لیے .... راستے مشہور ہیں۔ (کئی۔ دو۔ تین)

ii- پنجاب اب .... دریاؤں کی سرزمین ہے۔ (ساڑھے چار۔ پانچ۔ سات)

iii- نصف دریا کو اصطلاح میں .... کہتے ہیں۔ (نہر۔ راوی۔ راوی ضعیف)

iv- لاہور میں بہم رسانی آب کے لیے ابتدائی منصوبہ .... نے بنایا۔ (شیر شاہ سوری۔ نظام سقا۔ انگریزوں)

v- لاہور کے ہر مربع انچ میں ایک .... موجود ہے۔ (ہوٹل، انجمن، کالج)

3- تلخیص کا اُصول ہے کہ وہ اصل عبارت کی قریب قریب ایک تہائی ہو اور عبارت کے تمام اہم نکات تلخیص میں شامل ہوں۔ عبارت کا ایک موزوں عنوان تجویز کرنا بھی ضروری ہے۔ ایک نمونہ درج ذیل ہے۔

عبارت:

ایک دو غلط فہمیاں البتہ ضرور رفع کرنا چاہتا ہوں۔ لاہور پنجاب میں واقع ہے لیکن پنجاب اب پنج آب نہیں رہا۔ اس پانچ دریاؤں کی سرزمین میں اب صرف ساڑھے چار دریا بہتے ہیں اور جو نصف دریا ہے وہ تو اب بہنے کے قابل ہی نہیں رہا۔ اس کو اصطلاح میں راوی ضعیف کہتے ہیں۔ ملنے کا پتا یہ ہے کہ شہر کے قریب دو پل بنے ہوئے ہیں۔ ان کے نیچے ریت میں یہ دریا لیٹا رہتا ہے، بہنے کا شغل عرصے سے بند ہے۔ اس لیے یہ بتانا بھی مشکل ہے کہ شہر دریا کے دائیں کنارے پر واقع ہے یا بائیں

کنارے پر۔ (الفاظ:105)

مجوزہ عنوان:

لاہور کا جغرافیہ

تلخیص:

لاہور پنجاب میں واقع ہے جسے پنج آب نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ راوی بہنا چھوڑ چکا ہے۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ شہر دریا کے دائیں کنارے پر واقع ہے یا بائیں کنارے پر۔ (الفاظ:35)

اب آپ مذکورہ بالا نمونے کی روشنی میں نیچے دی گئی سبقی عبارت کی تلخیص کریں اور موزوں عنوان تحریر کریں۔

لاہور میں قابلِ دید.............................. بیان کر دیے گئے ہیں۔

4- مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کی وضاحت کریں۔

قِلّت۔ قابلِ دید۔ خلل انداز۔ اغراض و مقاصد۔ تعارف۔ ردّ و بدل۔ دائمی۔ دریافت۔ جامع۔ منسوخ

5- متن اور سیاق و سباق کے حوالے سے مندرجہ ذیل پیراگراف کی تشریح کریں۔

تمہید کے طور پر صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں.............................. آپ کی ذہانت فاتح ہے۔

شفیع عقیل

(1930ء - 2013ء)

دوستی کا پھل

کسی جنگل میں ایک کبوتر اور کبوتری رہتے تھے۔ ایک بڑے سے درخت پر ان کا گھونسلا تھا اور اس میں وہ دونوں امن چین کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ جب کبوتری نے گھونسلے میں انڈے دیے تو اسے ہر وقت اسی بات کی فکر لگی رہتی کہ:

''کہیں کوئی جانور انڈے نہ لے جائے۔''

یہی بات سوچتے ہوئے ایک روز وہ کبوتر سے کہنے لگی:

''ہمارا یہاں کوئی ایسا سنگی ساتھی نہیں ہے جو وقت پڑنے پر کام آسکے۔''

''لیکن تمھیں یہاں خطرہ کس بات کا ہے؟''

کبوتر نے حیرانی سے دریافت کیا۔ اس پر کبوتری اسے سمجھانے کے انداز میں بولی۔

''بُرا وقت کسی کو بتا کر نہیں آیا کرتا۔''

پھر اس نے قدرے سنجیدگی سے کہا:

''ہمیں اپنے ایک دو ساتھی ضرور بنانے چاہئیں تا کہ مصیبت کے وقت وہ ہماری مدد کر سکیں۔''

کبوتری کی یہ بات سن کر کبوتر بھی سوچ میں پڑ گیا۔ پھر وہ کچھ سوچ کر کہنے لگا۔

''تمھاری بات اپنی جگہ درست ہے مگر مصیبت یہ ہے کہ یہاں ہماری برادری کا کوئی پرندہ بھی تو نہیں رہتا۔ پھر دوست بنائیں تو کسے بنائیں؟''

کبوتری بولی:

''کوئی حرج نہیں۔ ہماری برادری کا کوئی پرندہ نہیں ہے تو نہ ہو۔ آخر کسی دوسری برادری کے پرندے یا جانور سے بھی تو تعلقات قائم کیے جاسکتے ہیں؟''

''اکیلا جاندار دنیا میں کسی کام کا نہیں ہوتا۔ ہمیں کوئی نہ کوئی ساتھی ضرور بنا لینا چاہیے۔''

سچ تو یہ ہے کہ کبوتری کی بات کبوتر کے دل کو لگ گئی تھی۔ آج تک اس کا اس طرف دھیان ہی نہ گیا تھا اور اب کبوتری کے کہنے پر اسے بھی احساس ہونے لگا تھا کہ کوئی نہ کوئی دوست ضرور ہونا چاہیے۔ وہ دل ہی دل میں اپنے اردگرد کے قریبی علاقے کے بارے میں سوچنے لگا کہ وہاں کون کون رہتا ہے؟ کچھ پرندے اس کے ذہن میں آئے لیکن وہ وہاں سے کافی فاصلے پر رہتے تھے۔ اس لیے ان سے

دوستی کرنا یا نہ کرنا برابر تھا کیونکہ وقت پڑنے پر انھیں اطلاع بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ سوچتے سوچتے کبوتر کو خیال آیا کہ جہاں وہ رہتے ہیں، اس سے ذرا آگے ایک دوسرے درخت پر گِدھوں کا ایک جوڑا رہتا ہے۔ اس نے کبوتری سے کہا:

''قریب ہی ایک درخت پر گِدھوں کا ایک جوڑا رہتا ہے۔ اگر تم کہو تو میں ان کے پاس جاؤں۔'' کبوتری جلدی سے بولی:

''اس میں سوچنے کی کیا بات ہے؟ ابھی جاؤ اور ان سے دوستی قائم کرو۔''

''مگر مجھے تو گِدھوں سے ڈر لگتا ہے۔ ان کا ہم سے میل مشکل ہی معلوم ہوتا ہے۔''

کبوتر سوچ میں پڑ گیا لیکن کبوتری نے پھر اسے سمجھاتے ہوئے کہا:

''گِدھ ہیں تو کیا ہے؟ ہیں تو پرندے؟ تم جا کر تو دیکھو۔''

''اچھا! تم کہتی ہو تو میں چلا جاتا ہوں۔''

کبوتر نے اتنا کہا اور اسی وقت اڑ کے گِدھوں کے جوڑے کے پاس جا پہنچا۔ وہاں پہنچ کر اس نے سلام دعا کی اور پھر بڑی اپنائیت سے کہنے لگا۔

''ہم سب ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں اور اس طرح ہمارا رشتہ سگوں جیسا ہے۔ پھر کیوں نہ ہم ایک دوسرے کے دوست بن جائیں؟''

اس پر گِدھ قدرے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہمسائے تو ماں جائے ہوتے ہیں۔ آپس کے دکھ سکھ میں شریک ہو کر ایک دوسرے کا سہارا بنتے ہیں۔''

کبوتر نے انھیں بھی اپنا ہم خیال پایا تو بولا۔

''میں اسی لیے تم لوگوں کے پاس آیا ہوں کہ آج سے ہم دوست بن جائیں۔''

جواب میں گِدھ بولا۔

''ہم تو آج سے ایک دوسرے کے دوست بن گئے ہیں مگر میری بات مانو تو ہم ایک اور کام کریں۔''

کبوتر نے پوچھا:

''وہ کیا؟''

جس پر گِدھ نے بتایا۔

''یہاں قریب ہی ایک درخت کی کھوہ میں ایک سانپ رہتا ہے۔ اگر وہ بھی ہمارا دوست بن جائے تو پھر ہم خطرے سے بالکل محفوظ ہو جائیں گے۔''

یہ تجویز کبوتر کو بھی پسند آئی ۔لہٰذا وہ بولا۔

''اگر یہ بات ہے تو چلو اس کے پاس چلتے ہیں ۔ ہو سکتا ہے، وہ بھی ہمارا دوست بن جائے۔''

چنانچہ گدھ اور کبوتر دونوں سانپ کے پاس پہنچ گئے ۔ سانپ کو اپنے آنے کا مقصد بتایا اور کہا۔

''یہ ٹھیک ہے کہ ہم تینوں مختلف برادری سے تعلق رکھتے ہیں مگر دوست بننے میں کیا حرج ہے؟''

''دوستی میں تو کوئی پابندی حائل نہیں ہوتی ؟''

سانپ نے ان دونوں کی باتوں کو بڑے غور سے سنا، کچھ دیر تک لیٹا ان پر سوچ بچار کرتا رہا اور پھر ان سے کہنے لگا۔

''دوستی بڑی مشکل ہوتی ہے۔اس میں ایک دوسرے کے لیے جان قربان کرنا پڑتی ہے۔''

''تم ہمیں، ہر امتحان میں ثابت قدم پاؤ گے۔''

دونوں نے بیک زبان سانپ سے کہا۔اس پر سانپ بولا:

''اگر یہ بات ہے تو مجھے تم دونوں کی دوستی منظور ہے۔ آج سے ہم تینوں دوست ہیں اور وقت پڑنے پر ایک دوسرے کی پوری پوری مدد کریں گے۔''

''بالکل ایسا ہی ہوگا۔''

اس طرح کبوتر، گدھ اور سانپ کی دوستی ہوگئی ۔اب کبوتری مطمئن تھی کہ وہ اکیلے نہیں رہے۔ان کے دوسرے ساتھی بھی ہیں۔

دن گذرتے گئے ۔کبوتری نے جو انڈے دیے تھے،اب ان کی جگہ ننھے منے بچوں نے لے لی تھی ۔ کبوتری اور کبوتر دن رات بچوں کی دیکھ بھال اور حفاظت میں لگے رہتے ۔ایک روز ایک شکاری اس طرف آنکلا ۔ وہ صبح سے مارا مارا پھر رہا تھا لیکن کوئی شکار اس کے ہاتھ نہیں لگا تھا۔ وہ اسی درخت کے نیچے آکر کھڑا ہو گیا جس پر کبوتر اور کبوتری نے گھونسلا بنا رکھا تھا۔اس نے دل میں سوچا۔

''خالی ہاتھ گھر جانا اچھی بات نہ ہوگی ۔ کیوں نہ کسی گھونسلے سے کسی جانور کے بچے ہی پکڑ کے لے چلوں ۔ کچھ تو مل جائے گا۔''

اتنا سوچ کر اس نے اردگرد سے درخت کا جائزہ لیا تو اسے اس پر ایک گھونسلا دکھائی دیا۔گھونسلا دیکھ کر اس نے اپنے تجربے سے اس کا اندازہ بھی کر لیا کہ گھونسلے میں کسی پرندے کے بچے بھی موجود ہیں ۔ اس وقت شام ہونے کو آئی تھی اور آہستہ آہستہ چاروں طرف اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔یہ دیکھ کر شکاری کے ذہن میں ایک ترکیب آئی ۔اس نے سوچا۔

''اگر میں درخت کے نیچے آگ جلادوں تو روشنی میں درخت پر گھونسلا تلاش کرنے میں آسانی رہے گی۔''

اس نے ادھر اُدھر سے چند سوکھی لکڑیاں اور گھاس پھونس جمع کی اور پھر ان میں آگ لگا کر الاؤ سا روشن کر دیا۔اس کے بعد وہ درخت پر چڑھنے کی تیاری کرنے لگا۔

ادھر درخت کے نیچے شکاری یہ تیاری کر رہا تھا اور ادھر درخت پر بیٹھے ہوئے کبوتر اور کبوتری یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ وہ شکاری

کی نیت بھانپ گئے تھے اور اب اپنے بچوں کو بچانے کی ترکیبیں سوچ رہے تھے جو ابھی اتنے چھوٹے تھے کہ اڑ بھی نہ سکتے تھے۔ کبوتر کبوتری سے کہنے لگا۔

''میں ابھی اپنے دوستوں کو خبر کرتا ہوں اور انھیں جلد بلا کر لاتا ہوں۔''

اس پر کبوتری کہنے لگی۔

''یہ درست ہے کہ تم اپنے دوستوں کو بلا لاؤ گے اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ وہ ہماری مدد کو آ بھی جائیں گے لیکن بہتر یہ ہے کہ پہلے ہم خود کوشش کریں۔ ہوسکتا ہے، دوسروں کی مدد کے بغیر ہی یہ مصیبت ٹل جائے۔''

''میرا تو خیال ہے پہلے اپنے دوستوں کو خبر کر دینی چاہیے۔''

کبوتر نے اپنی رائے پیش کرتے ہوئے کہا، جس پر کبوتری نے کہا:

''اگر کوئی اپنی مدد آپ نہ کرے تو دوسرے بھی اس کی مدد کو تیار نہیں ہوا کرتے۔ ہاں، اگر ہم اس کا مقابلہ کرنے میں ناکام ہو جائیں تو پھر تم اپنے دوستوں کو ضرور بلا لانا۔ مگر پہلے ہمیں خود ہی کچھ کرنا چاہیے۔''

شکاری آگ جلا چکا تھا اور اب اس نے اس کی روشنی میں درخت پر چڑھنا شروع کر دیا تھا۔ کبوتری نے جب اسے درخت پر چڑھتے ہوئے دیکھا تو کبوتر سے بولی۔

''اگر ہم آگ بجھا دیں تو شکاری اندھیرے میں ہمارا گھونسلا نہیں ڈھونڈ سکے گا۔''

''مگر ہم آگ کیسے بجھا سکتے ہیں؟''

کبوتر قدرے فکرمند ہوتے ہوئے بولا۔

''تم آؤ تو سہی! ہم کوشش کرتے ہیں۔''

کبوتری نے اتنا کہا اور وہ دونوں بجلی کی سی تیزی سے اڑ گئے۔ قریب ہی دریا بہہ رہا تھا۔ ان دونوں نے دریا پر پہنچ کر اپنے پروں میں پانی بھرا اور پھر آن کی آن میں واپس آ کر وہ پانی جلتی ہوئی آگ پر چھڑک دیا۔ وہ پھر اڑے اور دوبارہ پانی لا کر آگ پر چھڑکا اور اس طرح چند ہی لمحوں میں تین چار بار پانی لا کر انھوں نے آگ پر چھڑک دیا جس سے جلتی ہوئی آگ بجھ گئی۔

درخت پر چڑھتے ہوئے شکاری نے جب دیکھا کہ آگ بجھ گئی ہے اور اندھیرے میں گھونسلا تلاش کرنا مشکل ہے تو نیچے اتر کر اس نے دوبارہ آگ جلائی اور پھر سے درخت پر چڑھنے لگا۔ ادھر کبوتر اور کبوتری نے جب دیکھا کہ آگ دوبارہ روشن ہوگئی ہے تو وہ پھر سے بھاگے بھاگے دریا پر گئے اور پہلے کی طرح پروں میں پانی بھر بھر کر لا کر اس پر چھڑکنے لگے۔ اور اس طرح چند ہی لمحوں میں انھوں نے پھر آگ بجھا دی۔

شکاری ایک بار پھر درخت پر چڑھتے چڑھتے رک گیا۔ کچھ اندھیرا بھی بڑھ چکا تھا اور روشنی کے بغیر درخت پر چڑھنا ممکن نہیں تھا۔

اسے آگ پر رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا کہ یہ اپنے آپ بجھ کیسے جاتی ہے؟ وہ غصے میں کھولتا ہوا پھر درخت سے نیچے اترا اور ایک بار پھر ادھر اُدھر سے لکڑیاں جمع کر کے ان میں آگ لگا دی۔ اس دفعہ اس نے موٹی موٹی لکڑیاں جمع کی تھیں تا کہ جلنے کے بعد آگ بجھ نہ سکے۔ کبوتر اور کبوتری نے جب یہ دیکھا کہ اس دفعہ کی آگ بجھانا ان کے بس کی بات نہیں تو وہ بہت گھبرائے۔ اب دوستوں کی مدد ضروری تھی چنانچہ کبوتری نے کبوتر سے کہا:

''اب دوستوں سے مدد لینے کا وقت آ گیا ہے۔''

''جلدی جاؤ اور اپنے گدھ دوست کو مدد کے لیے بلا لاؤ۔''

یہ سنتے ہی کبوتر آن کی آن میں گدھ کے جوڑے کے پاس پہنچا اور انھیں ساری بات بتا کر کہا:

''اب مجھے تم لوگوں کی مدد کی ضرورت ہے۔''

گدھ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ سارے کام چھوڑ کر کہا:

''چلو! ہم ابھی چلتے ہیں۔ دوستی کس روز کام آئے گی؟''

کبوتر گدھوں کے جوڑے کو ساتھ لے کر آیا تو انھوں نے دیکھا کہ آگ پوری طرح جل رہی تھی اور اس کی روشنی میں شکاری درخت پر چڑھ رہا تھا۔ دونوں گدھ کبوتر اور کبوتری کے ساتھ جلدی جلدی دریا پر گئے اور انھوں نے اپنے بڑے بڑے پروں میں پانی بھر کے لا کر آگ پر پھینکنا شروع کر دیا۔ اس طرح دیکھتے ہی دیکھتے چند لمحوں میں جلتی ہوئی آگ بجھ گئی۔ یہ دیکھ کر شکاری تلملا کر رہ گیا۔ مصیبت یہ تھی کہ اب اندھیرا بہت زیادہ ہو چکا تھا۔ پھر یہ بھی تھا کہ شکاری بار بار درخت پر چڑھنے اترنے میں تھک چکا تھا۔ اس لیے اس نے دل میں سوچا۔

''اب آگ جلانا مشکل ہے۔ بہت رات ہو گئی ہے۔ کیوں نہ رات یہیں بسر کر لوں۔ صبح آسانی سے بچے نکال کر لے چلوں گا۔''

یہ سوچ کر وہ درخت سے تھوڑی دور زمین پر کپڑا بچھا کر لیٹ گیا۔ کبوتر اور گدھ نے جب یہ دیکھا کہ شکاری وہیں پر رات بسر کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور سونے کی تیاری کرنے لگا ہے تو وہ جان گئے کہ اس کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔ یہ صبح ضرور گھونسلے میں سے بچے نکال کر لے جائے گا۔ یہ جان کر وہ کچھ دوسری ترکیبیں سوچنے لگے۔ کبوتری نے رائے دی۔

''میری مانو تو تم دونوں اپنے دوست سانپ کے پاس جاؤ۔ اس وقت وہی ہماری مدد کر سکتا ہے۔''

''ہاں! وہ یقیناً اس وقت ہمارے کام آ سکتا ہے۔''

مادہ گدھ نے بھی کبوتری کی رائے پسند کی۔

کبوتر اور گدھ دونوں تھوڑی ہی دیر میں اپنے دوست سانپ کے پاس پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے شروع سے آخر تک اسے ساری بات بتائی اور پھر کہا۔

''اس وقت شکاری وہیں سویا ہوا ہے اور ہمیں ڈر ہے کہ وہ صبح ضرور بچے نکال کر لے جائے گا۔''

سانپ لیٹے لیٹے سوچنے لگا تو کبوتر بولا۔

''اب صرف تمھاری مدد ہی میرے بچوں کی زندگی بچا سکتی ہے۔''

''ہم اسی لیے تمھارے پاس آئے ہیں۔'' گدھ نے بھی کبوتر کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔ سانپ بڑے غور سے ان کی باتیں سُن کر کہنے لگا:

''تم لوگ گھبراؤ نہیں۔''

''اس وقت تم دونوں جاؤ، میں صبح سارا بندوبست کر لوں گا''

''جیسے تمھاری مرضی۔''

گدھ اور کبوتر نے کہا اور دونوں واپس گھونسلے میں آ گئے۔ وہاں آ کر انھوں نے کبوتری اور مادہ گدھ کو ساری بات بتائی اور کہا کہ

''سانپ نے ہمیں مدد کرنے کا یقین دلایا ہے۔ وہ ضرور اپنی دوستی نبھائے گا۔''

اس کے بعد وہ چاروں کے چاروں درخت پر بیٹھے بیٹھے صبح کا انتظار کرنے لگے۔

شکاری رات بھر بڑے مزے سے سویا اور جب صبح ہوئی تو وہ خوش خوش آنکھیں ملتا ہوا اٹھا کہ درخت پر چڑھ کر گھونسلے میں سے بچے نکالے اور اپنے گھر کی راہ لے۔ اس نے اٹھ کر اپنا سامان وغیرہ سمیٹا اور جوں ہی درخت پر چڑھنے کے لیے اس کے پاس گیا، اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ حواس باختہ ہو گیا۔ گھبراہٹ اور خوف میں اسے اپنا ہوش تک نہ رہا۔ اس کے تیر کمان کہیں تھے اور اب وہ اپنی جان بچانے کی فکر کر رہا تھا۔ اس نے دیکھا، جس درخت پر چڑھ کر اسے کبوتر کے گھونسلے سے بچے نکالنا تھے اس درخت کے تنے کے اردگرد بہت بڑا سانپ لپٹا ہوا اسے دیکھ دیکھ کر پھنکار رہا تھا۔ شکاری نے دل میں سوچا۔

''جس طرح بھی ہو اپنی جان بچاؤ۔ بھاڑ میں جائے شکار۔''

وہ اپنا سارا سامان چھوڑ چھاڑ کر الٹے پاؤں ایسا بھاگا کہ پھر پلٹ کر نہ دیکھا۔

وہ دن اور آج کا دن اس شکاری کا کہیں پتا نہیں چل سکا لیکن کبوتر آج بھی سکھ چین کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور یہ سب کچھ ان کی دوستی کا نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی لوگ دوستی اور امن کے پیغام کے لیے کبوتر ہی استعمال کرتے ہیں۔

(پنجابی لوک داستانیں)

مشق

-1 مختصر جواب دیں:

-i کبوتر، گِدھ اور سانپ میں قدرِ مشترک کیا تھی؟

-ii کبوتر، گِدھ اور سانپ دوستی اور باہمی تعاون پر کیوں آمادہ ہوئے؟

-iii شکاری کا کردار، کس بات کی علامت ہے؟

-iv کسی بیرونی خطرے کی صورت میں ہمیں کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے؟

-v پڑوسیوں سے تعلقات کی نوعیت کیا ہونی چاہیے؟

-vi معاشرے کی بقا کے لیے امدادِ باہمی کی کیا اہمیت ہے؟

-vii کبوتر کو کس بات کی علامت قرار دیا جاتا ہے؟

-viii اپنی مدد آپ کے اصول کی اہمیت، کہانی کی مدد سے بیان کیجیے۔

-2 ''دوستی کا پھل'' کا خلاصہ لکھیے۔

-3 مندرجہ ذیل الفاظ کا مفہوم لکھیے:

سَنگی، قدرے، سنجیدگی، برادری، حائل، فکر۔

نوٹ: لوک داستان، مقامی یا علاقائی زبان کی ایسی کہانی کو کہا جاتا ہے جو دوستی، ایثار، خلوص، ہمدردی، رحم، شجاعت، عدل، فرض شناسی، بہادری، جذبۂ حریت اور محبت جیسی اعلیٰ اخلاقی اقدار کی حامل ہو۔ ایسی کہانی نسل در نسل سنائی جاتی ہے اور لوک حافظے کا حصہ بنتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ صدیوں بعد لوک داستان کا درجہ اختیار کر لیتی ہے۔

آپ کوئی ایسی لوک کہانی لکھیں، جس کا عنوان ''نا اتفاقی کا انجام'' ہو اور ٹیوٹوریل گروپ میں سنائیں۔

ابنِ انشا

(1927ء-1978ء)

کیا واقعی دنیا گول ہے؟

ہم اس دھرتی کا گز بنے اور بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑا آئے لیکن ہمیں تو ہر چیز چپٹی ہی نظر آئی۔ دنیا سے زیادہ تو ہم خود گول ہیں کہ پیکنگ سے لڑھکے تو پیرس پہنچ گئے اور کوپن ہیگن سے پھسلے تو کولمبو میں آ کرر کے بلکہ جاکرتا[1] پہنچ کر دم لیا۔ دنیا کے گول ہونے پر اصرار کرنے والوں کا کہنا ہے کہ یقین نہ ہو تو مشرق کی طرف سے جاؤ، چکر کاٹ کر مغرب کی طرف سے پھر اپنے تھان پر آ کر کھڑے ہو گے۔ اس میں ہمیں ہمیشہ ایک بدیہی خطرہ نظر آیا کہ کہیں گولائی کی طرف رینگتے ہوئے نیچے نہ گر پڑیں کیونکہ ہم کوئی چھپکلی تھوڑا ہی ہیں۔

اس لڑکے کا قصہ آپ نے سنا ہوگا کہ آدھ سیر تیل لینے کے لیے کٹورا لے کر گیا تھا۔ کٹورا تھا چھوٹا، بھر گیا تو دکاندار نے کہا کہ ''باقی کس چیز میں ڈالوں''۔ برخوردار نے کٹورا اوندھا کر کے کہا۔ ''ادھر پیندے کے حلقے میں ڈال دو''۔ پیندا اوپر کر کے گھر گیا تو ماں نے کہا: ''بیٹے میں نے آدھ سیر تیل لانے کو کہا تھا۔ بس اتنا سا؟ بس یہی؟'' اس دانشمند نے اُسے بھی الٹا کر کہا ''ادھر بھی تو ہے''۔

ہم سوچتے ہیں کہیں ایسا نہ ہو مشرق ہاتھ میں رہے، نہ مغرب۔ کیا عجب سند باد کی طرح کسی نادیدہ جزیرے میں جا نکلیں جہاں کسی پیرِ تسمہ پا سے مڈبھیڑ کا بھی اتنا ہی خطرہ ہے جتنا کسی شہزادی مہر افروز کے ہم پر جان سے عاشق ہونے کا۔ بلکہ پہلا امکان کچھ زیادہ ہی ہے۔ تاہم اے دوستو! اب کیا ہو سکتا ہے۔ اب تو ہم دنیا کے گول ہونے کا ثبوت لینے کو چل دیے۔ گھر سے نکل پڑے جیسے حاتم طائی منیر شامی کی محبوبہ کی فرمائش پر انڈے کے برابر موتی اور کوہِ ندا کی تلاش میں نکل گیا تھا۔ کل صبح ہم کراچی میں تھے، دوپہر ڈھاکے میں۔ رات ہماری بنکاک میں گزری اور دمِ تحریر سنگاپور میں ہیں۔ ان سطور کے زیورِ طبع سے آراستہ ہونے تک جانیے

کونسی وادی میں ہو ، کونسی منزل میں ہو
عشق بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں

رشک آتا ہے کہ دنیا میں ایسے بھی لوگ ہیں کہ کبھی قیدِ مقام سے نہیں گزرتے۔ گوجرانوالہ تک گئے بھی تو دوسرے روز گھر لوٹ آئے۔ ہم سے پوچھیے جو مزا اور تھرل[2] ململ کا کرتا پہن، قوام والا پان کلّے میں دبا، ٹانگ پر ٹانگ دھرے گھر میں ''داستانِ امیر حمزہ'' پڑھنے اور لمبی تان کر سونے میں ہے وہ جگہ جگہ مارے مارے پھرنے میں کہاں، قیام کی راحتیں اور برکتیں کہاں تک بیان کی جائیں۔ نہ پاسپورٹ کی فکر نہ ویزا کے لیے بھاگ دوڑ۔ نہ فارن ایکسچینج[3] کا ٹنٹا، نہ ہوائی کمپنیوں کے دفتروں کے پھیرے کہ بھائی ایک سواری ہم بھی ہیں۔ بٹھا لو۔ ہمیں کہیں چندے قیام کا تجربہ ہو تو ایسا زبردست قیام نامہ لکھیں کہ لوگ حریفوں کے سفرناموں کو بھول جائیں۔ اے ناظرین! کبھی سفر کا ارادہ نہ کرنا۔ اجنبی دیسوں میں جگہ جگہ کے خطرات ہوتے ہیں۔ ٹیکسی والے ہیں، چور اُچکے ہیں، سامان لوٹنے والے، صبر و قرار لوٹنے والے وغیرہ۔

---

[1] جکارتہ [2] Thrill [3] Foreign Exchange

قلی وغیرہ قسم کی چیز بھی باہر کے ملکوں میں کم ہی ملتی ہے۔ انسان کو اپنے سوٹ کیس اور بقچیوں کے علاوہ اپنے ناز بھی بالعموم خود ہی اٹھانے پڑتے ہیں۔

او کراچی یونیورسٹی والو! نہ دو ہمیں ڈاکٹر کی ڈگری۔ ہم ڈاکٹر ہو ہی گئے۔ یہاں کے لوگوں کا ہمیں ڈاکٹر انشا کہتے ہوئے منہ سوکھتا ہے۔ ہم بھی اپنے دستخط کرتے ہوئے اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھنا نہیں بھولتے۔ اجمال اس تفصیل کا یہ ہے کہ ہم جس قافلۂ سخت جاں میں سفر کر رہے ہیں، ان میں بھی کچھ ترک ہیں، کچھ ایرانی، قریب قریب بھی ڈاکٹر، پاکستانیوں میں فضل الباری صاحب وزیر صحت ہیں یعنی ڈاکٹروں کے بھی ڈاکٹر۔ مسئلہ فقط بیگم وجیہہ ہاشمی کا تھا کہ اپوا[1] کی انٹرنیشنل سیکرٹری ہیں اور اسلام آباد کی رہنے والی ہیں یا پھر ہمارا۔ لوگوں سے تعارف میں بڑی دقت ہوتی تھی۔ آخر ایک مختصر سی اور سنجیدہ سی کنووکیشن[2] میں ہم نے انھیں اعزازی ڈاکٹر کی ڈگری پیش کی اور انھوں نے ہمیں ڈاکٹریٹ کے خریطے سے نوازا۔ انھیں اتنی دواؤں کے نام یاد ہیں اور ان کے نسخے کہ ڈاکٹر بھی ان کے تلمذ میں فخر محسوس کریں۔ لہٰذا ان کی ڈاکٹری بے غل وغش چل جاتی ہے۔ ہم میڈیکل ڈاکٹروں کے سامنے علم و ادب کے ڈاکٹر بنتے ہیں اور کوئی ادب و فلسفہ کا سوال کر بیٹھے تو میڈیکل ڈاکٹر ہونے کا عذر کرتے ہیں۔ ایک بزرگ نے دونوں طرح کے سوالات شروع کر دیے تو ہمیں ہومیو پیتھی میں امان ملی اور ہمیں اس کے فضائل پر تقریر کرنی پڑی۔ ایک بار تو دانتوں کا ڈاکٹر بھی بننا پڑا اور ڈاکٹر طیب محمود کی بتائی ہوئی اصطلاحیں کام آگئیں۔ بہر حال ہم پہلے سے بتائے دیتے ہیں کہ ہم اور ڈاکٹر وجیہہ ہاشمی پاکستان لوٹیں تو ہمیں باقاعدہ ڈاکٹر کہ کر بلایا جائے۔ جب دوسرے ملکوں کے لوگوں نے قبول کر لیا ہے تو ہمارے پیارے ہم وطنوں کو اس پر ہرگز اعتراض نہ ہونا چاہیے۔

(دنیا گول ہے)

مشق

1- درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگائیں۔

i- ''کیا واقعی دنیا گول ہے؟'' کے مصنف کا نام کیا ہے؟

ا۔ پطرس بخاری ب۔ ابنِ انشا ج۔ مشتاق احمد یوسفی د۔ کرنل محمد خان

ii- مصنف نے کس شہر میں جا کر دم لیا؟

ا۔ پیکنگ ب۔ کوپن ہیگن ج۔ جاکرتا د۔ کولمبو

iii- لڑکے کے ہاتھ میں کیا تھا؟

ا۔ پیالا ب۔ گلاس ج۔ پلیٹ د۔ کٹورا

vi- جب مصنف مضمون لکھ رہا تھا تو وہ کس شہر میں تھا؟

ا۔ بنکاک ب۔ کولمبو ج۔ سنگاپور د۔ کراچی

1۔ APWA۔ یہ All Pakistan Women's Association کا مخفف ہے جو خواتین کی کل پاکستان تنظیم ہے۔ 2۔ Convocation

2- مختصر جواب دیں۔

i- کیا دنیا واقعی گول ہے؟

ii- حاتم طائی کیا تلاش کرنے نکلا تھا؟

iii- مصنف کے ساتھیوں کا تعلق کس ملک سے ہے؟

iv- فضل الباری کون تھے؟

v- مصنف کے ہم وطنوں کو اس کے ڈاکٹر کہلوانے پر کیوں اعتراض نہیں کرنا چاہیے؟

3- ''کیا واقعی دنیا گول ہے؟'' کا خلاصہ لکھیں۔

4- مندرجہ ذیل الفاظ وتراکیب کے معنی لکھیں۔

اصرار، بدیہی، پیرِ تسمہ پا، دمِ تحریر، زیرِ طبع

5- کالم (الف) کا ربط کالم (ب) سے جوڑیں اور درست جواب کو کالم (ج) میں لکھیں۔

کالم (الف)	کالم (ب)	کالم (ج)
دھرتی کا	جگہ جگہ کے خطرات ہوتے ہیں۔	
بحرِ ظلمات میں	کون سی منزل میں ہو	
کبھی سفر کا	کٹورا لے کر گیا تھا	
اجنبی دیسوں میں	ارادہ نہ کرنا	
کون سی وادی میں ہو،	گھوڑے دوڑائے	
	گز بنے	

6- مندرجہ ذیل الفاظ کے متضاد لکھیں:

دھرتی، ماں، قیام، بالعموم، باقاعدہ۔

7- خالی جگہ پر کریں:

i- ہمیں ہمیشہ ایک ہی بدیہی خطرہ.........آیا۔

ii- برخوردار نے.........اوندھا کر کے کہا۔

iii- اے دوستو! اب کیا ہو.........ہے۔

iv- ہم ڈاکٹر ہو ہی.........

v- ہم میڈیکل ڈاکٹروں کے سامنے علم وادب کے.........بنتے ہیں۔

8- سیاق وسباق کے حوالے سے تشریح کریں:

رشک آتا ہے کہ.........حریفوں کے سفرناموں کو بھول جائیں۔

مشتاق احمد یوسفی

(ولادت:1923ء)

اور آنا گھر میں مُرغیوں کا

عرض کیا" کچھ بھی ہو۔ میں گھر میں مرغیاں پالنے کا روادار نہیں۔ میرا راسخ عقیدہ ہے کہ ان کا صحیح مقام پیٹ اور پلیٹ ہے اور شاید.............." "اس راسخ عقیدے میں میری طرف سے پتیلی کا اور اضافہ کر لیجیے۔" انھوں نے بات کاٹی۔ پھر عرض کیا" اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں کوئی مُرغی عمرِ طبیعی کو نہیں پہنچ پاتی۔ آپ نے خود دیکھا ہوگا کہ ہماری ضیافتوں میں میزبان کے اخلاص و ایثار کا اندازہ مرغیوں اور مہمانوں کی تعداد اور ان کے تناسب سے لگایا جاتا ہے۔"

فرمایا" یہ صحیح ہے کہ انسان روٹی پر ہی زندہ نہیں رہتا.......... اسے مرغ مسلّم کی بھی خواہش ہوتی ہے۔ اگر آپ کا عقیدہ ہے کہ خدا نے مرغی کو محض انسان کے کھانے کے لیے پیدا کیا تو مجھے اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ صاحب! مرغی تو درکنار، میں تو انڈے کو بھی دنیا کی سب سے بڑی نعمت سمجھتا ہوں۔ تازے خود کھایئے۔ گندے ہو جائیں تو ہوٹلوں اور سیاسی جلسوں کے لیے دُگنے داموں بیچیے۔ یُوں تو اس میں.......... میرا مطلب ہے تازہ انڈے میں

ع   ہزاروں خُوبیاں ایسی کہ ہر خوبی پہ دم نکلے

مگر سب سے بڑی خُوبی یہ ہے کہ پھوہڑ سے پھوہڑ عورت کسی طرح بھی پکائے یقیناً مزے دار پکے گا۔ آملیٹ، نیم برشت، تلا ہوا حلوا.........." اس کے بعد انھوں نے ایک نہایت پیچیدہ اور گنجلک تقریر کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ آملیٹ وغیرہ بگاڑنے کے لیے غیر معمولی سلیقہ اور صلاحیت درکار ہے جو فی زمانہ مفقود ہے۔

اختلاف کی گنجائش نظر نہ آئی تو میں نے پہلو بچا کر وار کیا" یہ سب درست! لیکن اگر مُرغیاں کھانے پر اُتر آئے تو ایک ہی ماہ میں دڑبے کے دڑبے صاف ہو جائیں گے۔" کہنے لگے" یہ نسل مٹائے نہیں مٹتی۔ جہاں تک اس جنس کا تعلق ہے دو اور دو چار نہیں بلکہ چالیس ہوتے ہیں۔ یقین نہ آئے تو خود حساب کر کے دیکھ لیجیے۔ فرض کیجیے کہ آپ دس مرغیوں سے مرغبانی کی ابتدا کرتے ہیں۔ ایک اعلیٰ نسل کی مرغی سال میں اوسطاً دو سو سے ڈھائی سو تک انڈے دیتی ہے لیکن آپ چونکہ فطرتاً قنوطی واقع ہوئے ہیں، اس لیے یہ مانے لیتے ہیں کہ آپ کی مُرغی صرف ڈیڑھ سو انڈے دے گی۔"

میں نے ٹوکا" مگر میری قنوطیت کا مُرغی کے انڈے دینے کی صلاحیت سے کیا تعلق؟" بولے "بھئی آپ تو قدم قدم پر اُلجھتے ہیں۔ قنوطی سے ایسا شخص مراد ہے جس کا یہ عقیدہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے آنکھیں رونے کے لیے بنائی ہیں۔ خیر، اس کو جانے دیجیے۔ مطلب یہ ہے کہ اس حساب سے پہلے سال میں ڈیڑھ ہزار انڈے ہوں گے اور دوسرے سال ان انڈوں سے جو مُرغیاں نکلیں گی وہ دو لاکھ پچیس ہزار انڈے دیں گی جن سے تیسرے سال اسی محتاط اندازے کے مطابق تین کروڑ سینتیس لاکھ پچاس ہزار چوزے نکلیں

گے۔ بالکل سیدھا سا حساب ہے۔''

''مگر یہ سب کھائیں گے کیا؟'' میں نے بے صبری سے پوچھا۔ ارشاد ہوا اس کی خوبی یہی ہے کہ اپنا رزق آپ تلاش کرتا ہے۔ آپ پال کر تو دیکھیے۔ دانہ دُنکا، کیڑے مکوڑے، کنکر پتھر چگ کے اپنا پیٹ بھر لیں گے۔''

پوچھا ''اگر مرغیاں پالنا اس قدر آسان اور نفع بخش ہے تو آپ اپنی مرغیاں مجھے کیوں دینا چاہتے ہیں۔'' فرمایا ''یہ آپ نے پہلے ہی کیوں نہ پوچھ لیا۔ ناحق ردّ و قدح کی۔ آپ جانتے ہیں کہ میرا مکان پہلے ہی کس قدر مختصر ہے۔ آدھے میں ہم رہتے ہیں اور آدھے میں مرغیاں۔ اب مشکل یہ آ پڑی ہے کہ کل کچھ عزیز چھٹیاں گزارنے آ رہے ہیں۔ اس لیے..........''

اور دوسرے دن ان کے نصف مکان میں عزیز اور ہمارے گھر میں مرغیاں آ گئیں۔

اب اس کو میری سادہ لوحی کہیے یا خلوصِ نیت کہ شروع شروع میں میرا خیال تھا کہ انسان محبت کا بھوکا ہے اور جانور اس واسطے پالتا ہے کہ اپنے مالک کو پہچانے اور اس کا حکم بجا لائے۔ گھوڑا اپنے سوار کا آسن اور ہاتھی اپنے مہاوت کا آنکس پہچانتا ہے۔ کتا اپنے مالک کو دیکھتے ہی دُم ہلانے لگتا ہے جس سے مالک کو روحانی خوشی ہوتی ہے۔ سانپ بھی سپیرے سے ہل جاتا ہے لیکن مُرغیاں؟ میں نے آج تک کوئی مُرغی ایسی نہیں دیکھی جو کسی اور کو پہچانے اور جس کو اپنے پرائے کی تمیز ہو۔ مہینوں ان کی نگہداشت اور سنبھال کیجیے۔ برسوں ہتھیلیوں پر چگایئے۔ لیکن کیا مجال کہ آپ سے ذرا بھی مانوس ہو جائیں۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ میں یہ اُمید لگائے بیٹھا ہوں کہ میرے دہلیز پر قدم رکھتے ہی مُرغ سرکس کے طوطے کی مانند توپ چلا کر سلامی دیں گے یا چوزے میرے پاؤں میں وفادار کتے کی طرح لوٹیں گے، اور مرغیاں اپنے اپنے انڈے ''سپردم بتو مایۂ خویش را''[1] کہتی مجھے سونپ کر اُلٹے قدموں واپس چلی جائیں گی۔ تاہم پالتو جانور سے خواہ وہ شرعاً حلال ہی کیوں نہ ہو، یہ توقع نہیں کی جاتی کہ وہ ہر چمکتی ہوئی چیز کو چھری سمجھ کر بدکنے لگے اور مہینوں کی پرورش و پرداخت کے باوجود محض اپنے جبلی تعصب کی بنا پر ہر مسلمان کو اپنے خون کا پیاسا تصوّر کرے۔

ایک عام خوش فہمی جس میں تعلیم یافتہ اصحاب بالعموم اور اُردو شعرا بالخصوص عرصے سے مبتلا ہیں، یہ ہے کہ مُرغ صرف صبح اذان دیتے ہیں۔ اٹھارہ مہینے اپنی عادات و خصائل کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یا تو میں جان بوجھ کر عین اس وقت سوتا ہوں جو قدرت نے مُرغ کے اذان دینے کے لیے مقرر کیا ہے یا یہ ادبدا کر اس وقت اذان دیتا ہے جب خدا کے گنہگار بندے خواب غفلت میں پڑے ہوں۔ بہر صورت ہمارے محبوب ترین اوقات اتوار کی صبح اور سہ پہر ہیں۔ آج بھی چھوٹے قصبوں میں کثرت سے ایسے خوش عقیدہ حضرات مل جائیں گے جن کا ایمان ہے کہ مُرغ بانگ نہ دے تو پو نہیں پھٹتی لہٰذا کفایت شعار لوگ الارم والی ٹائم پیس خریدنے کے بجائے مُرغ پال لیتے ہیں تاکہ ہمسایوں کو سحر خیزی کی عادت رہے۔ بعضوں کے گلے میں قدرت نے وہ سحر جلال عطا کیا ہے کہ نیند کے ماتے تو ایک طرف رہے، ان کی بانگ سُن کر ایک دفعہ تو مردہ بھی کفن پھاڑ کے اکڑوں بیٹھ جائے۔ آپ نے کبھی غور کیا کہ دوسرے جانوروں کے مقابلے میں مُرغ کی آواز، اس کی جسامت کے لحاظ سے کم از کم سو گنا زیادہ ہوتی ہے۔

---

[1] میں اپنی دولت آپ کے سپرد کرتا ہوں۔

میرا خیال ہے کہ اگر گھوڑے کی آواز بھی اسی تناسب سے بنائی گئی ہوتی تو تاریخی جنگوں میں توپ چلانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

اب یہاں یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ آخر مُرغ اذان کیوں دیتا ہے؟ ہم پرندوں کی نفسیات کے ماہر نہیں۔ البتہ معتبر بزرگوں سے سنتے چلے آئے ہیں کہ صبح دم چڑیوں کا چہچہانا اور مُرغ کی اذان دراصل عبادت ہے لہٰذا جب مرزا عبدالودود بیگ نے ہم سے پُوچھا کہ مُرغ اذان کیوں دیتا ہے؟ تو ہم نے سیدھے سبھاؤ یہی جواب دیا کہ اپنے رب کی حمد وثنا کرتا ہے۔ کہنے لگے "صاحب! اگر یہ جانور واقعی اتنا عبادت گزار ہے تو لوگ اسے اتنے شوق سے کیوں کھاتے ہیں؟"

ایک دن موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ تھکا ماندہ بارش میں شرابور گھر پہنچا تو دیکھا کہ تین مُرغے میرے پلنگ پر ہیں۔ سفید چادر پر جابجا پنجوں کے تازہ نشان تھے۔ البتہ میری قبل از وقت واپسی کے سبب جہاں جہاں جگہ خالی رہ گئی وہاں سفید دھبے نہایت بدنما معلوم ہو رہے تھے۔ میں نے ذرا درشتی سے سوال کیا "آخر یہ گلا پھاڑ پھاڑ کے کیوں چیخ رہے ہیں؟"

بولیں "آپ تو خواہ مخواہ الرجک ہو گئے ہیں۔ یہ بیچارے چونچ بھی کھولیں تو آپ سمجھتے ہیں کہ مجھے چڑا رہے ہیں؟" میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ دل نے کہا "بس بہت ہو چکا۔ آؤ آج دو ٹوک فیصلہ ہو جائے۔ اس گھر میں اب یا تو یہ رہیں گے یا میں" میں نے پھر کر کہا۔ ان کی آنکھوں میں سچ مچ آنسو بھر آئے۔ ہراساں ہو کر کہنے لگیں "مینہ برستے میں آپ کہاں جائیں گے؟" اس جنس کے بارے میں ایک مایوس کن انکشاف یہ بھی ہوا کہ خواہ آپ موتی چگائیں، خواہ سونے کا نوالا کھلائیں، مگر اس کو کیڑے مکوڑے، جھینگر، بھنگے، چیونٹے اور بچھوے کھانے سے باز نہیں رکھ سکتے اور میں یہ باور کرنے کے لیے تیار نہیں کہ اس کا اثر ونفوذ انڈے میں نہ ہو..... پھر موپساں کے ایک افسانے کا ہیرو اگر یہ دعویٰ کرے کہ وہ زردی کی بو سے یہ بتا سکتا ہے کہ مُرغی نے کیا کھایا تھا، تو اچنبھے کی بات نہیں۔ خود ہمارے ہاں ایسے ایسے لائق قیافہ شناس دال روٹی پر جی رہے ہیں جو ذرا سی بوٹی چکھ کے بکری کے چارے کا مفصل حال بتا سکتے ہیں۔ آپ نے سنا ہوگا کہ کھلی اور بھوسہ کی خاصیت اور چوپایوں کی خصلت کے پیشِ نظر بعض نفاست پسند والیانِ ریاست اس بات کا بڑا خیال رکھتے تھے کہ جن بھینسوں کے دودھ کی بالائی ان کے دسترخوان پر آئے، ان کو صبح وشام بادام اور پستے کھلائے جائیں تاکہ اس کا اصل ذائقہ اور مہک بدل جائے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں عمدہ دودھ کی خوبی یہ تھی کہ اسے پی کر کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ یہ دودھ ہے۔

ایک اور سنگین غلط فہمی جس میں خواص و عوام مبتلا ہیں اور جس کا ازالہ میں رفاہِ عام کے لیے نہایت ضروری خیال کرتا ہوں، یہ ہے کہ مُرغیاں دڑبے اور ٹاپے میں رہتی ہیں۔ میرے ڈیڑھ سال کے مختصر مگر بھرپور تجربے کا نچوڑ یہ ہے کہ مُرغیاں دڑبے کے سوا ہر جگہ نظر آتی ہیں اور جہاں نظر نہ آئیں وہاں اپنے ورود ونزول کا ناقابلِ تردید ثبوت چھوڑ جاتی ہیں۔ ان آنکھوں نے بارہا غسل خانے سے انڈے اور کتابوں کی الماری سے جیتے جاگتے چوزے نکلتے دیکھے۔ لحاف سے کڑک مُرغی اور دڑبے سے شیو کی پیالی برآمد ہونا روزمرہ کا معمول ہو گیا اور یوں بھی ہوا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور میں نے لپک کر ریسیور اٹھایا۔ مگر میرے "ہیلو" کہنے سے پیشتر ہی مرغ نے میری ٹانگوں کے درمیان کھڑے ہو کر اذان دی اور جن صاحب نے ازراہِ تلطّف مجھے یاد فرمایا تھا انھوں نے "سوری! رانگ نمبر!" کہہ کر جھٹ فون بند کر دیا۔ قصہ مختصر چند ہی مہینوں میں اس طائرِ لاہوتی نے گھر کا وہ نقشہ کر دیا کہ اسے دیکھ کر وہی شعر پڑھنے کو جی چاہتا تھا، جو قدرے مختلف حالات میں، حُسنا پری نے حاتم طائی کو سُنایا تھا:

یہ گھر جو کہ میرا ہے تیرا نہیں
پر اب گھر یہ تیرا ہے میرا نہیں

اب گھر اچھا خاصا پولٹری فارم (مُرغی خانہ) معلوم ہوتا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ پولٹری فارم میں عام طور سے اتنے آدمیوں کے رہنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ جو حضرات آلام دنیوی سے عاجز و پریشان رہتے ہوں، ان کو میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ مُرغیاں پال لیں۔ پھر اس کے بعد پردۂ غیب سے کچھ ایسے نئے مسائل اور فتنے خود بخود اٹھ کھڑے ہوں گے کہ انھیں اپنی گزشتہ زندگی جنت کا نمونہ معلوم ہوگی۔

(چراغ تلے)

مشق

1- درست جواب کے گرد دائرہ لگائیں۔

i- مصنف کے خیال میں مرغی کا صحیح مقام کیا ہے؟

(کھیت، وڑبہ، پلیٹ)

ii- میزبان کے اخلاص و ایثار کا اندازہ کن باتوں سے ہوتا ہے؟

(تحفے سے، طویل قیام سے، دستر خواں پر مرغیوں کی تعداد سے)

iii- گندے انڈوں کا موزوں محل استعمال کیا ہے؟

(جلسہ، ٹوکری، کرکٹ میچ)

iv- مرغ کی آواز اور جسامت میں کیا تناسب ہے؟

(ایک اور دو کا، ایک اور چالیس کا، ایک اور سو کا)

2- سبق کے حوالے سے مختصر جوابات لکھیں۔ جواب تین سطور سے زیادہ طویل نہ ہو۔

i- مصنف کے دوست اپنی مرغیاں، مصنف کو کیوں دینا چاہتے تھے؟

ii- کفایت شعار لوگ مرغ کیوں پالتے ہیں؟

iii- ''اس گھر میں اب یا تو یہ رہیں گے یا میں!'' یہ جملہ مصنف نے کس موقع پر کسے کہا اور نتیجہ کیا نکلا؟

iv- مرغیوں کی پسندیدہ خوراک کیا ہے؟

v- ''سوری! رانگ نمبر'' سے مصنف کا جو تجربہ وابستہ ہے، بیان کیجیے۔

3- مندرجہ ذیل عبارات کی تشریح، حوالۂ متن اور سیاق و سباق کے ساتھ کریں۔

i- مہینوں ان کی .... پیاسا تصور کرے۔

ii- ایک عام خوش فہمی..................غفلت میں پڑے ہوں۔

4- مندرجہ ذیل الفاظ وتراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کریں:

پردۂ غیب، راسخ عقیدہ، عمرِ طبیعی، گنجائش، خوش فہمی۔

5- مناسب الفاظ لگا کر خالی جگہ پُر کریں:

i- میں گھر میں..................پالنے کا روادار نہیں۔

ii- انسان صرف روٹی پر ہی..................نہیں رہتا۔

iii- اختلاف کی..................نظر نہ آئی۔

iv- انسان محبت کا..................ہے۔

v- مرغ صرف صبح..................اذان دیتے ہیں۔

حصّة نظم

(امیر احمد) امیر مینائی
(1828ء-1900ء)

حمد

دوسرا کون ہے ، جہاں تو ہے
کون جانے تجھے ، کہاں تو ہے

لاکھ پردوں میں ہے تو بے پردہ
سو نشانوں پہ، بے نشاں تو ہے

تو ہے خلوت میں، تو ہے جلوت میں
کہیں پنہاں، کہیں عیاں تو ہے

نہیں تیرے سوا، یہاں کوئی
میزباں تو ہے، مہماں تو ہے

رنگ تیرا، چمن میں بو تیری
خوب دیکھا تو باغباں تو ہے

محرمِ راز تو بہت ہیں امیر
جس کو کہتے ہیں راز داں، تو ہے

مشق

1- ''حمد'' کے متن کو مدنظر رکھتے ہوئے نیچے دیے گئے ہر سوال کے درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگائیں۔

i- ایسی نظم جس میں اللہ تعالیٰ کی تعریف کی جائے اسے کیا کہتے ہیں؟

الف۔ حمد ب۔ نعت ج۔ منقبت د۔ قصیدہ

ii- یہ ''حمد'' کس شاعر کی تخلیق ہے؟

الف۔ مولانا ظفر علی خاں ب۔ امیر مینائی ج۔ بہزاد لکھنوی د۔ ماہر القادری

2- ہر شعر کے آخر میں آنے والے ہم آواز اور ہم وزن الفاظ کو ''قافیہ'' کہتے ہیں جبکہ قافیے کے بعد بار بار جوں کے توں دہرائے جانے والے الفاظ ''ردیف'' کہلاتے ہیں۔ اب آپ بتائیے۔

i- اس حمد میں ردیف کیا ہے؟

الف۔ تو ہے ب۔ ہے ج۔ کہاں تو ہے د۔ راز داں تو ہے

ii- اس حمد میں ''قافیہ'' کیا ہے؟

الف۔ جہاں، کہاں، باغباں ب۔ تو ہے ج۔ ہے د۔ بو تیری

3- حمد میں شامل مندرجہ ذیل الفاظ کو اس طرح جملوں میں استعمال کریں کہ ان کی تذکیر و تانیث واضح ہو جائے۔

خلوت۔ جلوت۔ نشاں۔ میزباں۔ چمن۔ بو۔ جلوہ۔

4- اس 'حمد' کا خلاصہ زیادہ سے زیادہ دس جملوں میں تحریر کریں۔

5- اس حمد کا مرکزی خیال ایک یا دو جملوں میں تحریر کریں۔

6- کسی اور شاعر کی کوئی اچھی سی 'حمد' تلاش کر کے اپنی ڈائری میں لکھیں۔

ماہرالقادری

(1906ء-1978ء)

نعت

تُو مقصدِ تخلیق ہے، تُو حاصلِ ایماں
جو تجھ سے گریزاں، وہ خدا سے ہے گریزاں

کردار کا یہ حال، صداقت ہی صداقت
اَخلاق کا یہ رنگ کہ قرآں ہی قرآں

کیا نام ہے، شامل ہے جو تکبیرواذاں میں
اس نام کی عظمت کے ہیں قربان ، دل و جاں

اشکوں سے ترے ، دین کی کھیتی ہوئی سیراب
فاقوں نے ترے ، دہر کو بخشا سروساماں

انسان کو شائستہ و خوددار بنایا
تہذیب و تمدّن ، ترے شرمندۂ احساں

رحمت کا یہ عالم ہے، مروّت کا یہ انداز
ماؔہر سا گنہگار ہے، وابستۂ داماں!

مشق

سوال 1۔نعت کے متن کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل سوالات کے دیے ہوئے جوابات میں سے درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگائیں۔

i- جس نظم میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف کی جائے اسے کیا کہتے ہیں؟

ا۔ حمد ب۔ نعت ج۔ منقبت د۔ قصیدہ

ii- اس نعت کے شاعر کا نام کیا ہے؟

ا۔ علامہ اقبال ب۔ مولانا حالی ج۔ ماہرالقادری د۔ عبدالعزیز خالد

iii- اس نعت میں ردیف کیا ہے؟

ا۔ ایماں ب۔ احساں ج۔ داماں د۔ ردیف موجود نہیں

iv- مندرجہ ذیل میں سے کون سا لفظ نعت کا قافیہ ہے؟

ا۔ گریزاں ب۔ فاقوں ج۔ اذاں د۔ اشکوں

سوال 2۔ مندرجہ ذیل شعر کی تشریح کریں۔

کردار کا یہ حال، صداقت ہی صداقت
اَخلاق کا یہ رنگ کہ قرآں ہی قرآں

سوال 3۔ مندرجہ ذیل شعر کا مرکزی خیال لکھیں۔

انسان کو شائستہ و خوددار بنایا
تہذیب و تمدّن ترے شرمندۂ احساں

سوال 4۔ اس نعت میں استعمال ہونے والے قافیوں کی نشاندہی کریں۔

سوال 5۔ مندرجہ ذیل الفاظ کا مفہوم لکھیں:

حاصل، گریزاں، صداقت، عظمت، سیراب۔

سوال 6۔ اس نعت میں سے اپنی پسند کے دو شعر لکھیں اور اپنی پسند کی وجہ بھی بیان کریں۔

سوال 7۔ کسی اور شاعر کی کوئی نعت اپنی ڈائری میں لکھیں اور اس کے قافیوں کی نشان دہی کریں۔

نظیراکبرآبادی
(1735ء-1830ء)

تسلیم و رضا

جو فقر میں پورے ہیں، وہ ہر حال میں خوش ہیں
ہر کام میں ، ہر دام میں، ہر حال میں خوش ہیں
گر مال دیا یار نے تو مال میں خوش ہیں
بے زر جو کیا تو اُسی احوال میں خوش ہیں
افلاس میں ' ادبار میں ' اقبال میں خوش ہیں
پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں

گر یار کی مرضی ہوئی ، سر جوڑ کے بیٹھے
گھر بار چھڑایا تو وہیں چھوڑ کے بیٹھے
موڑا انھیں جیدھر ، وہیں منہ موڑ کے بیٹھے
گدڑی جو سلائی تو وہی اوڑھ کے بیٹھے
اور شال اڑھائی تو اسی شال میں خوش ہیں
پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں

گر اُس نے دیا غم تو اُسی غم میں رہے خوش
اور اُس نے جو ماتم دیا ، ماتم میں رہے خوش
کھانے کو ملا کم تو اسی کم میں رہے خوش
جس طور کہا اُس نے ، اُس عالم میں رہے خوش
دکھ درد میں ، آفات میں ، جنجال میں خوش ہیں
پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں

جینے کا نہ اندوہ ، نہ مرنے کا ذرا غم
یکساں ہے اُنھیں زندگی اور موت کا عالم
واقف نہ برس سے ، نہ مہینے سے وہ اک دم
نہ شب کی مصیبت ، نہ کبھی روز کا ماتم
دن رات ، گھڑی پہر ، مہ و سال میں خوش ہیں
پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں

اُن کے تو جہاں میں ، عجب عالم ہیں نظیر ، آہ
سب ایسے تو دُنیا میں ولی ، کم ہیں نظیر ، آہ
کیا جانے ، فرشتے ہیں کہ آدم ہیں نظیر ، آہ
ہر وقت میں ، ہر آن میں خرّم ہیں نظیر ، آہ
جس ڈھال میں رکھا ، وہ اُسی ڈھال میں خوش ہیں
پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں

مشق

1- نظم ''تسلیم و رضا'' کے متن کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے درج ذیل سوالات کے درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگائیں۔

i- اس نظم میں ''مرد'' سے کیا مراد لی گئی ہے؟

ا۔ بچے ب۔ بوڑھے ج۔ خواتین د۔ تمام انسان

ii- ''پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں'' مصرع نظم 'تسلیم و رضا' کے

ا۔ ہر بند کا آخری مصرع ہے۔ ب۔ دوسرے اور تیسرے بند کا آخری مصرع ہے۔

ج۔ آخری بند کا آخری مصرع ہے۔ د۔ صرف پہلے بند کا آخری مصرع ہے۔

iii- ''جو فقر میں پورے ہیں وہ ہر حال میں خوش ہیں'' کا دوسرا مصرع کیا ہے؟

ا۔ اخلاص میں، ادبار میں، اقبال میں خوش ہیں ب۔ بے زر جو کیا تو اسی احوال میں خوش ہیں

ج۔ دکھ درد میں، آفات میں، جنجال میں، خوش ہیں د۔ ہر کام میں، ہر دام میں، ہر حال میں، خوش ہیں

2- نظم ''تسلیم و رضا'' کا مرکزی خیال تحریر کریں جو تین سطروں سے زیادہ نہ ہو۔

3- نظم ''تسلیم و رضا'' کے تیسرے بند کی تشریح کریں۔

4- نظم ''تسلیم و رضا'' کے ہم آواز الفاظ کے پانچ پانچ جوڑے لکھیں جیسے:

حال، مال

5- نظم ''تسلیم و رضا'' کا خلاصہ لکھیں جو دس جملوں سے زیادہ نہ ہو۔

6- نظیر اکبر آبادی کی کوئی اخلاقی نظم پڑھیں اور اُس کے پسندیدہ اشعار اپنی ڈائری میں لکھیں۔

7- اپنے تعلیمی ادارے کے میگزین کے لیے نظیر اکبر آبادی کے چند اشعار منتخب کریں۔

میر انیس

(1800ء-1874ء)

میدانِ کربلا میں صبح کا منظر

ٹھنڈی ہوا میں ، سبزۂ صحرا کی وہ لہک   شرمائے جس سے ، اطلسِ زنگاریِ فلک
وہ جھومنا درختوں کا ، پھولوں کی وہ مہک   ہر برگِ گل پہ ، قطرۂ شبنم کی وہ جھلک
ہیرے خجل تھے ، گوہرِ یکتا نثار تھے
پتے بھی ہر شجر کے ، جواہر نگار تھے

وہ نور اور وہ دشت سہانا سا وہ فضا   درّاج و کبک و تیہو و طاؤس کی صدا
وہ جوشِ گل ، وہ نالۂ مرغانِ خوش نوا   سردی جگر کو بخشتی تھی ، صبح کی ہوا
پھولوں سے سبز سبز شجر ، سرخ پوش تھے
تھالے بھی نخل کے ، سبدِ گل فروش تھے

وہ دشت وہ نسیم کے جھونکے ، وہ سبزہ زار   پھولوں پہ جا بجا ، وہ گہرہائے آب دار
اٹھنا وہ جُھوم جُھوم کے شاخوں کا ، بار بار   بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ، ہزار
خواہاں تھے زیب گلشن زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے

وہ قمریوں کا چار طرف سرو کے ، ہجوم   کو کو کا شور ، نالۂ حق سرّہٗ کی دُھوم
سبحان ربّنا کی صدا تھی ، علی العموم   جاری تھے وہ جو اُن کی عبادت کے تھے رسوم
کچھ گل فقط نہ کرتے تھے ، ربِّ علی کی مدح
ہر خار کو بھی نوکِ زباں تھی ، خُدا کی مدح

چیونٹی بھی ہاتھ اُٹھا کے ، یہ کہتی تھی ، بار بار   اے دانہ کش ضعیفوں کے رازق ، ترے نثار
یا حیُّ یا قدیر کی تھی ہر طرف پکار   تسبیح تھی کہیں ، کہیں تہلیلِ کردگار
طائر ہوا میں مست ، ہرن سبزہ زار میں
جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

مشق

-1 ''میدانِ کربلا میں صبح کا منظر'' پیشِ نظر رکھتے ہوئے نیچے دیے گئے ہر دُرست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگائیں۔

-i برگ گل پر کس کی جھلک تھی؟

الف۔ آفتاب کی کرن کی　　ب۔ قطرۂ شبنم کی

ج۔ مہتاب کی کرن کی　　د۔ انجم کی کرن کی

-ii صبح کی ہوا کسے سردی بخشتی تھی؟

الف۔ روح کو　　ب۔ جان کو　　ج۔ دل کو　　د۔ جگر کو

-iii ''اے دانہ کش ضعیفوں کے رازق ترے نثار'' کس کی زبان پر تھا؟

الف۔ چیونٹی کی　　ب۔ ہرن کی　　ج۔ شیر کی　　د۔ قمری کی

-2 نظم ''میدانِ کربلا میں صبح کا منظر'' کا مرکزی خیال تحریر کریں جو تین جملوں سے زائد نہ ہو۔

-3 مختصر جواب لکھیں جو تین سطروں سے زائد نہ ہوں۔

-i پہلے بند کے پہلے دونوں اشعار کے قوافی کی نشان دہی کریں۔

-ii نظم کا کوئی ایسا شعر لکھیں جس میں ردیف موجود ہے۔

-iii اس نظم میں کن کن جانوروں اور پرندوں کے نام آئے ہیں؟

-4 نظم ''میدانِ کربلا میں صبح کا منظر'' کے آخری بند کی تشریح کریں۔

-5 نظم ''میدانِ کربلا میں صبح کا منظر'' کا خلاصہ لکھیں جو زیادہ سے زیادہ دس جملوں پر محیط ہو۔

-6 ان تراکیب کا مطلب لکھیں۔

سبزۂ صحرا، جوشِ گل، نالۂ مرغانِ خوش نوا، برگِ گل، نالۂ حق سرۂ۔

مولانا ظفر علی خان
(1873ء-1956ء)

مستقبل کی جھلک

کوئی دن جاتا ہے پیدا ہوگی اک دنیا نئی
خونِ مسلم صرفِ تعمیرِ جہاں ہوجائے گا

بجلیاں غیرت کی تڑپیں گی فضائے قدس میں
حق عیاں ہوجائے گا ، باطل نہاں ہوجائے گا

ان کواکب کے عوض ،ہوں گے نئے انجم طلوع
ان دنوں رخشندہ تر ، یہ آسماں ہوجائے گا

پھر نئے محمود ہوں گے حامیِ دینِ متیں
بچّہ بچّہ ، غیرتِ الپ ارسلاں ہوجائے گا

میرے جیسے ہوں گے پیدا ، سیکڑوں اہلِ سخن
نکتہ نکتہ جن کا' آزادی کی جاں ہو جائے گا

ڈھائی جائے گی بنا ، یورپ کے استعمار کی
ایشیا ، آپ اپنے حق کا پاسباں ہو جائے گا

نغمہ آزادی کا گونجے گا حرم اور دَیر میں'
وہ جو دارالحرب ہے' دارالاماں ہو جائے گا

ہم کو سودا ہے غلامی کا ، کہ آزادی کی دُھن
چند ہی دن میں ، ہمارا امتحاں ہو جائے گا

اس بشارت کو نہ سمجھو ، ایک دل خوش کُن قیاس
جس کو سُن کر ہر مسلماں' شادماں ہو جائے گا

سچ ہے میرا حرف حرف اور جس کو اس میں شک ہے آج
دیکھ لینا کل مرا ' ہم داستاں ہو جائے گا

مشق

1- نظم کا متن پیشِ نظر رکھتے ہوئے درج ذیل سوالات کے درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگائیں۔

i- 'ہو جائے گا' اس نظم میں کیا ہے؟

ا۔ تشبیہ ب۔ استعارہ ج۔ قافیہ د۔ ردیف

ii- کواکب کے عوض کیا طلوع ہوں گے؟

ا۔ نئے خورشید ب۔ نئے ماہتاب ج۔ نئے انجم د۔ نئے اجرام

iii- کن کا نکتہ نکتہ آزادی کی جاں ہوگا؟

ا۔ اہلِ قلم کا ب۔ اہلِ سخن کا ج۔ اہلِ وفا کا د۔ اہلِ ہنر کا

iv- دینِ متیں کے حامی کون ہوں گے؟

ا۔ نئے محمود ب۔ نئے ایاز ج۔ نئے طارق د۔ نئے ایوبی

2- رخشندہ تر، محمود، دین متیں۔ یورپی استعمار۔ خوش کن قیاس کے مفہوم کی وضاحت کریں۔

3- تلمیح کی تعریف لکھیں اور اس نظم کے اُس شعر کی تشریح کریں جس میں تلمیح استعمال ہوئی ہے۔

4- نظم ''مستقبل کی جھلک'' کا خلاصہ تحریر کریں جو دس جملوں سے زیادہ نہ ہو۔

5- نظم ''مستقبل کی جھلک'' کا مرکزی خیال ایک دو جملوں میں تحریر کریں۔

6- نظم ''مستقبل کی جھلک'' کے پہلے اور آٹھویں شعر کی تشریح کریں۔

7- مولانا ظفر علی خاں کی ملی حوالے سے لکھی گئی کوئی اور نظم ڈائری میں لکھیں اور ٹیوٹوریل گروپ میں سنائیں۔

اختر شیرانی
(1903ء-1948ء)

برسات

گھٹاؤں کی نیل فام پریاں، اُفق پہ دُھومیں مچا رہی ہیں
ہواؤں میں تھرتھرا رہی ہیں، فضاؤں کو گدگدا رہی ہیں
چَمن شگفتہ، دَمَن شگفتہ، گلاب خنداں، سَمَن شگفتہ
بنفشہ و نسترن شگفتہ ہیں، پتیاں مُسکرا رہی ہیں

یہ مینہ کے قطرے مچل رہے ہیں، کہ ننھے سیارے ڈھل رہے ہیں
اُفق سے موتی اُبل رہے ہیں، گھٹائیں موتی لٹا رہی ہیں
نہیں ہے کچھ فرق بحر و بر میں، کھنچا ہے نقشہ یہی نظر میں
کہ ساری دنیا ہے اک سمندر، بہاریں جس میں نہا رہی ہیں
چمن ہے رنگیں، بہار رنگیں، مناظرِ سبزہ زار رنگیں
ہیں وادی و کوہسار رنگیں، کہ بجلیاں رنگ لا رہی ہیں

چَمن میں اختر بہار آئی، لہک کے صوت ہزار آئی
صبا گلوں میں پکار آئی، اُٹھو گھٹائیں پھر آ رہی ہیں

مشق

-1 ''برسات'' کے متن کو پیشِ نظر رکھ کر ہر درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگائیں۔

-i ''نیل فام'' سے کیا مُراد ہے؟

الف۔ سُرخ رنگ کی   ب۔ نیلے رنگ کی

ج۔ سفید رنگ کی   د۔ سیاہ رنگ کی

-ii ''اُفق'' کسے کہتے ہیں؟

الف۔ اس جگہ کو جہاں زمین اور آسمان ملتے ہیں   ب۔ آسمان کو

ج۔ آسمان پر پھیلنے والی سُرخی کو   د۔ فضا کو

iii- بقول شاعر ساری دُنیا کیا ہے؟

ا۔ ایک چمن ب۔ ایک دریا ج۔ ایک سمندر د۔ ایک ننھا سیارہ

2- مندرجہ ذیل الفاظ وتراکیب کی تشریح کریں۔

بحروبر۔ مناظرِ سبزہ زار۔ وادی وکوہسار۔ نیل فام۔ چمن۔

3- اس نظم میں ''ردیف'' کی نشان دہی کریں۔

4- ان اشعار کی تشریح کریں۔

گھٹاؤں کی نیل فام پریاں، افق پہ دھومیں مچا رہی ہیں
ہواؤں میں تھرتھرا رہی ہیں، فضاؤں کو گدگدا رہی ہیں
چمن شگفتہ، دَمن شگفتہ، گُلاب خنداں، سمن شگفتہ
بنفشہ و نسترن شگفتہ ہیں، پتیاں مُسکرا رہی ہیں

5- جب کسی لفظ کو اُس کے اصل معنی کی بجائے مجازی معنی میں اس طرح استعمال کیا جائے کہ اصل اور مجازی معنی میں تشبیہ کا تعلق ہو تو اُسے استعارہ کہتے ہیں۔ اس شعر میں استعارے کی نشان دہی کریں۔

یہ مینہ کے قطرے مچل رہے ہیں کہ ننھے سیارے ڈھل رہے ہیں
افق سے موتی اُبل رہے ہیں، گھٹائیں موتی لٹا رہی ہیں

6- نظم ''برسات'' کا خلاصہ لکھیے جو زیادہ سے زیادہ دس جملوں پر محیط ہو۔

7- باغ کی سیر کا آنکھوں دیکھا حال لکھیں۔

حفیظ جالندھری
(1900ء-1982ء)

ہلالِ استقلال

یہ استقلال کا پرچم ہے ، استحکام کا پرچم
شہیدوں غازیوں کے ہاتھ سے ، انعام کا پرچم
ہلالی خنجر ، انگشتِ شہادت کا اشارا ہے
یہ سیف اللہ کا پرتو ، فلک پر آشکارا ہے
ہلالِ خنجر قومی عطیہّ ہے شہیدوں کا
جو خود قربان ہو کر ، بھر گئے دامن نویدوں کا
حسینؓ ابن علیؓ کے اسوہ مردانہ کا پرچم
برائے شمعِ ملّت ، سوزشِ پروانہ کا پرچم
محمد ابنِ قاسمؒ کے سحابِ جُود کا پرچم
یہ طارقؒ کا ، صلاح الدّینؒ کا ، محمودؒ کا پرچم
یہ پرچم ہے نشاں ، عالم میں فتح و کامرانی کا
زمیں پر ابرِ رحمت ہے ، نویدِ آسمانی کا
یہ پرچم ہے روایاتِ عظیم الشان کا پرچم
یہی پرچم ہے استقلالِ پاکستان کا پرچم

مشق

-1 نظم "ہلال استقلال" کے متن کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر سوال کے درست جواب کے شروع میں "✓" کا نشان لگائیں۔

-i شاعر نے کسے "زمین پر ابر رحمت" کہا ہے؟

ا۔ ہلالی پرچم کو
ب۔ مال ودولتِ دنیا کو
ج۔ اشاعتِ اسلام کو
د۔ خوش حالی کو

ii- "سیف اللہ" سے شخصیت مراد ہیں:

الف۔ طارقؒ بن زیاد

ب۔ محمودؒ غزنوی

ج۔ خالدؓ بن ولید

د۔ صلاح الدین ایوبیؒ

iii- "ہلالِ خنجرِ قومی" کن کا عطیہ ہے؟

الف۔ مجاہدوں کا

ب۔ شہیدوں کا

ج۔ سیاست دانوں کا

د۔ فوجی جرنیلوں کا

2- اس نظم کے اشعار میں شامل تلمیحات کی الگ الگ وضاحت کریں۔

3- مندرجہ ذیل تراکیب کی وضاحت کریں۔

انگشتِ شہادت، ہلالِ خنجرِ قومی، شمعِ ملت، سحابِ جود، فتح وکامرانی، ابرِ رحمت، نویدِ آسمانی، اُسوۂ مردانہ۔

4- اس نظم کا خلاصہ لکھیں جو دس سطور سے زیادہ نہ ہو۔

5- اس نظم میں سے اپنے تین پسندیدہ اشعار منتخب کریں، اُنھیں اپنی ڈائری میں لکھیں اور ٹیوٹوریل گروپ میں پڑھ کر سنائیں۔

علامہ محمد اقبالؒ
(1877ء-1938ء)

خطاب بہ جوانانِ اسلام

کبھی اے نوجواں مسلم! تدبّر بھی کیا تو نے؟ وہ کیا گردوں تھا، تُو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا؟
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں، تاجِ سرِ دارا
تمدّن آفریں، خلاقِ آئینِ جہاں داری وہ صحرائے عرب، یعنی شتربانوں کا گہوارا
سماں اَلْفَقْرُ فَخْرِی[1] کا، رہا شانِ امارت میں ''بآب ورنگ و خال و خط، چہ حاجت روئے زیبا را''[2]
گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے کہ مُنعم کو گدا کے ڈر سے، بخشش کا نہ تھا یارا
اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں مگر تیرے تخیّل سے فزوں تر ہے، وہ نظارا
تجھے آبا سے اپنے، کوئی نسبت ہو نہیں سکتی کہ تو گفتار، وہ کردار، تو ثابت، وہ سیارا
گنوادی ہم نے، جو اسلاف سے میراث پائی تھی ثُریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا
حکومت کا تو کیا رونا، کہ وہ اک عارضی شے تھی نہیں دنیا کے آئینِ مسلّم سے کوئی چارا
مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

''غنی روزِ سیاہ پیرِ کنعاں را تماشا کن
کہ نُورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را''[3]

---

1. حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امارت کی بجائے فقر پر فخر محسوس کیا۔ ''الفقر فخری'' آپؐ ہی کے الفاظِ مبارک ہیں۔
2. خوب صورت چہرے کو ظاہری زیبائش کی حاجت نہیں ہوتی۔ (حافظ شیرازی کا مصرع ہے)
3. اے غنی! پیرِ کنعان کی بدنصیبی تو دیکھ کہ ان کی آنکھوں کا نُور زلیخا کی آنکھوں کو روشن کر رہا ہے (یہ شعر غنی کاشمیری کا ہے)۔

پیغام [1]

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں! ذرا
دانہ تُو، کھیتی بھی تُو، باراں بھی تُو ، حاصِل بھی تُو
آہ ! کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے
راہ تُو، رہرو بھی تُو، رَہبر بھی تُو، منزل بھی تُو
کانپتا ہے دل ترا ، اندیشۂ طوفاں سے کیا
ناخدا تُو، بحر تُو، کشتی بھی تُو، ساحل بھی تُو
دیکھ آ کر کوچۂ چاکِ گریباں میں کبھی!
قیس تُو، لیلیٰ بھی تُو، صحرا بھی تُو، محمل بھی تُو
وائے نادانی ! کہ تو محتاجِ ساقی ہو گیا
مَے بھی تُو، مینا بھی تُو، ساقی بھی تُو، محفل بھی تُو
شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللّٰہ کو
خوفِ باطل کیا کہ ہے غارت گرِ باطل بھی تُو
بے خبر! تُو جوہرِ آئینۂ ایّام ہے
تُو زمانے میں خُدا کا آخری پیغام ہے

مشق

-1 علامہ محمد اقبالؒ کی نظموں کے متن کو مدنظر رکھتے ہوئے درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگائیں:

-i علامہ محمد اقبالؒ نے ''خطاب بہ جوانانِ اسلام'' کے پہلے شعر میں مسلم نوجوان سے کیا کہا ہے؟

ا۔ تدبر بھی کیا تُو نے؟ ب۔ تصور بھی کیا تُو نے؟

ج۔ ارادہ بھی کیا تُو نے؟ د۔ تحیر بھی کیا تُو نے؟

-ii مسلم نوجوان کو کس قوم نے آغوشِ محبت میں پالا ہے؟

ا۔ جس نے شہنشاہِ رُوم کو شکست دی ب۔ جس نے قیصرو کسریٰ پر فتح پائی

ج۔ جس نے آدھی دنیا پر حکومت کی د۔ جس نے تاج سردارا کچل ڈالا

---

[1] یہ اشعار نظم ''شمع اور شاعر'' سے لیے گئے ہیں۔

-iii ''منعم'' کے لغوی معنی ہیں۔

ا۔ دولت مند تخی　　　ب۔ انعام واکرام

ج۔ انعام پانے والا　　　د۔ سخی بادشاہ

-2 ''خطاب بہ جوانان اسلام'' میں آنے والی تلمیحات کی مختصر تشریح کریں جو تین تین سطروں سے زیادہ نہ ہو۔

-3 مندرجہ ذیل اشعار کی تشریح کریں۔

الف۔

حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی　　نہیں دُنیا کے آئین مسلّم سے کوئی چارا

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی　　جو دیکھیں اُن کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

ب۔

شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیراللہ کو　　خوفِ باطل کیا کہ ہے غارت گر باطل بھی تو

-4 ''خطاب بہ جوانان اسلام'' اور ''پیغام'' کا مرکزی خیال لکھیں۔

-5 ''خطاب بہ جوانانِ اسلام'' اور ''پیغام'' کا خلاصہ لکھیں۔

-6 مندرجہ ذیل الفاظ وتراکیب کی وضاحت کریں۔

تدبر، تاجِ سردارا، مُنعم، حکومت کا رونا، اندیشۂ طوفاں، آئین مسلّم، سیپارہ۔

سید محمد جعفری

(1911ء-1976ء)

ایبسٹریکٹ آرٹ [1]

ایبسٹریکٹ آرٹ کی دیکھی تھی نمائش میں نے
کی تھی ازراہِ مروّت بھی ستائش میں نے
آج تک دونوں گناہوں کی سزا پاتا ہوں
لوگ کہتے ہیں کہ کیا دیکھا تو شرماتا ہوں
ایک تصویر کو دیکھا جو کمالِ فن تھی
بھینس کے جسم پہ اک اونٹ کی سی گردن تھی
ٹانگ کھینچی تھی کہ مسواک جسے کہتے ہیں
ناک وہ ناک خطرناک جسے کہتے ہیں
ایک تصویر کو دیکھا کہ یہ کیا رکھا ہے
ورقِ صاف پہ رنگوں کو گرا رکھا ہے
آڑی ترچھی سی لکیریں تھیں وہاں جلوہ فگن
جیسے ٹوٹے ہوئے آئینے پہ سورج کی کرن
اس نمائش میں جو اطفال چلے آتے تھے
ڈر کے ماؤں کے کلیجے سے لپٹ جاتے تھے
الغرض جائزہ لے کر یہ کیا ہے انصاف
آج تک کر نہ سکا اپنی خطا خود میں معاف
میں نے یہ کام کیا ، سخت سزا پانے کا
یہ نمائش نہ تھی اک خواب تھا دیوانے کا

---

[1] Abstract Art تجریدی آرٹ

مشق

1- درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگائیں۔

i- شاعر نے تصاویر کی تعریف کیوں کی؟

ا۔ ان سے متاثر ہو کر   ب۔ فن کی باریکی کو سمجھ کر

ج۔ ان کی خوب صورتی کی وجہ سے   د۔ محض مروّت سے

ii- شاعر نے تصویر میں بھینس کے جسم پر کس جانور کی گردن دکھائی ہے؟

ا۔ گائے کی   ب۔ اونٹ کی

ج۔ بکری کی   د۔ ہاتھی کی

iii- شاعر کے خیال میں نمائش حقیقت میں کیا تھی؟

ا۔ ایک یادگار نمائش   ب۔ دیوانے کا خواب

ج۔ آرٹ کی خدمت   د۔ تصاویر کا قابلِ قدر نمونہ

2- مندرجہ ذیل الفاظ کو اپنے جملوں میں استعمال کریں:

ستائش، مصوّر، اطفال، جائزہ، نمائش۔

3- نظم کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیں۔

4- مختصر جواب دیں:

i- شاعر نے کس قسم کے آرٹ کی نمائش دیکھی؟

ii- کیا شاعر اس نمائش سے متاثر ہوا؟

iii- شاعر نے اس نمائش کی تعریف کیوں کی؟

iv- نمائش کی تصویروں کا بچوں پر کیا اثر ہوا؟

v- شاعر اس نمائش کو کیا قرار دیتا ہے؟

5- نظم کے آخری دو اشعار کی تشریح کریں۔

6- سید محمد جعفری کی کوئی اور مزاحیہ نظم اپنی ڈائری میں لکھیں۔

مرزا محمود سرحدی
(1913ء-1967ء)

قطعات

شاعر

کل ایک مفکّر مجھے کہتا تھا سرِ راہ
شاید تری مِلّت کا ہے مٹنے کا ارادہ
میں نے یہ کہا اُس سے کوئی وجہ بھی ہو گی
بولا کہ تری قوم میں شاعر ہیں زیادہ

....

اخباری اشتہار

نوکری کے لیے اخبار کے اعلان نہ پڑھ
جان پہچان کی باتیں ہیں، کہا مان، نہ پڑھ
جن کو ملنی ہو، انھیں پہلے ہی مل جاتی ہے
بس دکھاوے ہی کے ہوتے ہیں یہ فرمان نہ پڑھ

....

غفلت

اے ساقیِ گل فام بُرا ہو ترا تُو نے
باتوں میں لبھا کر ہمیں وہ جام پلایا
یہ حال ہے سو سال غلامی میں بسر کی
اور ہوش ہمیں اب بھی مکمل نہیں آیا

....

ریڈیو

جن کو انگریز کا قانون ہو ازبر اُن سے
اور سب پوچھ مگر شرع کے احکام نہ پوچھ
ریڈیو میں بھی جو قرآں کی تلاوت نہ سنیں
اُن مسلمانوں کی اولاد کا اسلام نہ پوچھ

....

مشق

1- محمود سرحدی کے قطعات مدنظر رکھ کر مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب تحریر کریں:

i- شاعر نے ملت کے مٹنے کی کیا وجہ بیان کی ہے؟

ii- ''ساقیِ گُل فام'' سے کیا مراد لی گئی ہے؟

iii- قطعہ 'غفلت' میں ہماری کس خاص حالت کا ذکر کیا گیا ہے؟

iv- قطعہ ریڈیو، اور اخباری اشتہار کا مرکزی خیال لکھیے۔

v- آپ کو کون سا قطعہ پسند آیا اور کیوں؟

نوٹ: قطع عربی کا لفظ ہے، جس کا مطلب کاٹنا یا ٹکڑے کرنا ہے۔ لفظ ''قطعہ'' اسی سے بنا ہے جس کا مطلب کاٹا ہوا کوئی حصہ یا ٹکڑا ہے۔
اصنافِ سخن کی اصطلاح میں قطعے سے مراد کم از کم دو شعروں کا وہ حصہ ہے جو قصیدے اور غزل کی طرح ہم قافیہ یا ہم قافیہ وردیف ہو اور اس کے ساتھ ساتھ مضمون میں معنوی ربط یا تسلسل ضروری ہے۔

کسی اور مزاحیہ وطنزیہ قطعے کو اپنی ڈائری میں لکھیں اور ٹیوٹوریل گروپ میں پڑھ کر سنائیں۔

دلاور فگار

(1928ء-1998ء)

لوکل بس

بس میں لٹک رہا تھا کوئی ، ہار کی طرح
کوئی پڑا تھا ، سایۂ دیوار کی طرح
سہما ہوا تھا کوئی ، گنہگار کی طرح
کوئی پھنسا تھا ، مرغِ گرفتار کی طرح

محروم ہو گیا تھا کوئی ، ایک پاؤں سے
جوتا بدل گیا تھا کسی کا ، کھڑاؤں سے

گاڑی میں ایک شور تھا ، کنڈکٹر آگے چل
کہ دے خدا کے واسطے ، ہاں ٹھیک ہے ڈبل
کب تک کھڑا رہے گا بہ رِچارۂ عمل
لڑنے کی آرزو ہے تو باہر ذرا نکل

تجھ پہ خدا کی مار ہو ، اسٹارٹ کر دے بس
دو پیسے اور لے لے جو دولت کی ہے ہوس

کنڈکٹر اب یہ کہتا تھا ، وہ بس چلائے کیوں
جو بس میں آ گیا ہے ، کرے ہائے ہائے کیوں
جس کو ہو جاں عزیز ' مری بس میں آئے کیوں
ایسے ہی گل بدن تھے تو پیسے بچائے کیوں

ٹھانی ہے دل میں ، اب نہ دبیں گے کسی سے ہم
تنگ آ گئے ہیں ، روز کی کنڈکٹری سے ہم

مشق

1- نظم ''لوکل بس'' کے متن کو پیش نظر رکھ کر ہر درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگائیں۔

i- بس میں کوئی لٹک رہا تھا۔

ا۔ ہار کی طرح　　ب۔ گرفتار کی طرح

ج۔ بیمار کی طرح　　د۔ گنہگار کی طرح

ii- لوگ کنڈکٹر کو کتنے پیسے اور دینے کو تیار تھے؟

ا۔ دو　　ب۔ پانچ

ج۔ دس　　د۔ بیس

iii- کنڈکٹر کس سے تنگ آ گیا تھا؟

ا۔ مسافروں سے　　ب۔ بس کی حالت سے

ج۔ تنگ دستی سے　　د۔ کنڈکٹری سے

2- اس نظم کے دوسرے اور تیسرے بند میں کنڈکٹر اور مسافر کے درمیان ہونے والی کھینچا تانی کو مکالمے کے انداز میں لکھیں۔

3- مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کا مطلب لکھیں۔

سایۂ دیوار، مرغ گرفتار، سرچارۂ عمل، گل بدن، کھڑاؤں۔

4- نظم ''لوکل بس'' کا خلاصہ لکھیں۔

5- ''بس میں سفر'' کی روداد ڈائری میں لکھیں۔

6- کسی اور شاعر کی ایک مزاحیہ نظم اپنی ڈائری میں لکھیں اور ٹیوٹوریل گروپ میں پڑھیں۔

مست توکلی

(1828ء-1895ء)

وحدانیت

اے خدا، تُو ہے واحد و یکتا
ہے یہ شاہی فقط تجھے زیبا
تُو اگر قہر پر اُتر آئے
تیری سطوت کا ہی رہے چرچا
اور اگر رحمتوں پہ مائل ہو
کوئی مشفق نہیں ترے جیسا
قہر و رحمت پہ قادر، اے ستار
میرا مقصد ہے بس ترا جلوا
جب قیامت کی آئے گی ساعت
دید سے اپنی بہرہ ور فرما
مثل مجنوں کے ہوں جنوں ساماں
میرا پیکر گُنہ میں ہے ڈوبا
باوجودیکہ پُر ہوں عصیاں سے
تیری رحمت کا پھر بھی ہے سودا

(ترجمہ۔ طارق قریشی)

مشق

1- نظم ''وحدانیت'' کے متن کو پیش نظر رکھتے ہوئے، درج ذیل سوالات کے درست جواب پر (✓) کا نشان لگائیں۔

I- پہلے شعر میں اللہ تعالٰی کی کس صفت کا ذکر ہے؟

(ا) وحدت و یکتائی ب۔ سطوت ج۔ رحمت د۔ شفقت

ii- چوتھے شعر میں شاعر نے اپنے کون سے دلی مقصد کا اظہار کیا ہے؟

(ا) اپنی مغفرت کا حصول ب۔ اللہ کی رحمت کا حصول

ج۔ اللہ کے جلوے کا حصول د۔ توبہ کی توفیق کا حصول

iii- شاعر نے اپنے پیکر کے بارے میں کیا کہا ہے؟

(ا) گنہ میں ڈوبا ہوا ہے۔ ب۔ بہت کمزور ہے

ج۔ جنوں ساماں اور لاغر ہے۔ د۔ تمام قویٰ مضبوط ہیں

2- اس نظم کے تمام قوافی الگ الگ کر کے لکھیں۔

3- اس نظم کے اُس شعر کی تشریح کریں جس میں تلمیح استعمال کی گئی ہو۔

4- اس نظم کا مرکزی خیال تحریر کریں جو تین سطروں سے زیادہ نہ ہو۔

5- شاعر کو گنہگار ہونے کے باوجود کس بات کا سودا ہے؟

6- نظم ''وحدانیت'' کا خلاصہ لکھیں۔

7- ''وحدانیت'' کس شاعر کے کلام کا ترجمہ ہے۔

حصّہ غزل

میر تقی میر

(1723ء-1810ء)

(1)

جس سر کو غرور آج ہے ، یاں تاج وری کا
کل ، اس پہ یہیں شور ہے ، پھر نوحہ گری کا

آفاق کی منزل سے گیا ، کون سلامت
اسباب لٹا راہ میں ، یاں ہر سفری کا

ہر زخمِ جگر داورِ محشر سے ہمارا
انصاف طلب ہے ، تری بیدادگری کا

لے سانس بھی آہستہ ، کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کار گہِ شیشہ گری کا

ٹک میؔر جگر سوختہ کی ، جلد خبر لے
کیا یار بھروسا ہے ، چراغ سحری کا

(2)

گل کو ہوتا صبا ! قرار اے کاش!
رہتی اک آدھ دن ، بہار اے کاش!

یہ جو دو آنکھیں ، مُند گئیں میری
اس پہ وا ہوتیں ، ایک بار اے کاش!

کن نے اپنی مصیبتیں نہ گنیں
رکھتے میرے بھی غم ، شمار اے کاش!

جان آخر تو جانے والی تھی
اس پہ کی ہوتی ، مَیں نثار اے کاش!

اس میں راہِ سخن نکلتی تھی
شعر ہوتا ترا شعار ، اے کاش!

شش جہت اب تو تنگ ہے ہم پر
اس سے ہوتے نہ ہم ، دو چار اے کاش!

مشق

1- شامل نصاب میر کی پہلی غزل میں تاج وری، نوحہ گری، سفری، بیدادگری، شیشہ گری اور چراغ سحری ہم آواز الفاظ ہیں۔ شعری اصطلاح میں ایسے ہم آواز الفاظ کو قافیہ کہتے ہیں۔ اسی غزل کے ہر شعر میں قافیے کے بعد "کا" بغیر کسی ردو بدل کے استعمال ہوا ہے۔ ایسے لفظ یا الفاظ کو شعری اصطلاح میں ردیف کہتے ہیں۔ قافیہ کا لغوی مفہوم ہے پے در پے آنے والا، پیچھے پیچھے آنے والا۔ اصطلاحی مفہوم میں قافیہ اُن ہم آواز الفاظ کو کہتے ہیں جو غزل یا قصیدے کے مطلع کے دونوں مصرعوں میں اور باقی تمام اشعار کے ہر دوسرے مصرعے کے آخر پر اور ردیف سے پہلے آتے ہیں۔ جیسے دونوں غزلوں میں تاج وری، سفری، قرار، بہار وغیرہ۔

ردیف کا لغوی مفہوم ہے گھڑسوار کے پیچھے بیٹھنے والا۔ اصطلاحی معنی میں اس سے مراد وہ لفظ یا الفاظ ہیں جو غزل یا قصیدے کے پہلے شعر کے دونوں مصرعوں میں اور باقی تمام اشعار کے ہر دوسرے مصرعے کے آخر پر قافیے کے بعد ہو بہو دہرائے جاتے ہیں۔
جیسے پہلی غزل میں "کا"۔

آپ میر کی دوسری غزل کے قوافی اور ردیف کی نشان دہی کریں۔

2- غزل کا پہلا شعر، جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوں، مطلع کہلاتا ہے۔ میر کی دونوں غزلوں کے مطلعے لکھیں اور اُن کی تشریح کریں۔

3- مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات میں سے درست جواب پر نشان "✓" لگائیں۔

i- "جس سر کو غرور آج ہے یاں تاجوری کا" .... کس شاعر کی غزل کا مصرع ہے؟

ا۔ علامہ اقبال کی ب۔ مولانا حالی کی ج۔ آتش د۔ میر تقی میر کی

ii- گل کو ہوتا صبا قرار اے کاش! رہتی ایک آدھ دن بہار اے کاش!

یہ شعر غزل میں کیا ہے۔

ا۔ مطلع ب۔ مقطع ج۔ قافیہ د۔ ردیف

iii- ٹک میرِ جگر سوختہ کی جلد خبر لے کیا یار بھروسا ہے چراغ سحری کا

یہ شعر غزل میں کیا ہے؟

ا۔ مطلع ب۔ مقطع ج۔ قافیہ د۔ ردیف

iv- میر تقی میر کی وجہِ شہرت کیا ہے؟

ا۔ نظم گوئی ب۔ مثنوی نگاری ج۔ غزل گوئی د۔ مزاحیہ شاعری

4- مندرجہ ذیل الفاظ وتراکیب کے معنی لکھیں۔

تاج وری، بیدادگری، چراغِ سحری، شش جہت، قرار۔

5- میر تقی میر کی کوئی اور غزل لکھیں اور اس میں سے مطلع اور مقطع الگ کر کے لکھیں۔

اس غزل کے قافیے اور ردیف بھی ترتیب وار لکھیں۔

حیدر علی آتش

(1764ء-1846ء)

(1)

ہوائے دورِ مئے خوش گوار ، راہ میں ہے
خزاں چمن سے ہے جاتی ، بہار راہ میں ہے

عدم کے کوچ کی لازم ہے فکر ، ہستی میں
نہ کوئی شہر، نہ کوئی دیار ، راہ میں ہے

نہ بدرقہ ہے ، نہ کوئی رفیق ساتھ اپنے
فقط عنایتِ پروردگار ، راہ میں ہے

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجرِ سایہ دار ، راہ میں ہے

مقام تک بھی ہم اپنے ، پہنچ ہی جائیں گے
خدا تو دوست ہے ، دشمن ہزار ، راہ میں ہے

تھکیں جو پاؤں تو چل سر کے بل، نہ ٹھہر آتش
گلِ مراد ہے منزل میں ، خار راہ میں ہے

(2)

یہ آرزو تھی ، تجھے گل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبلِ بے تاب ، گفتگو کرتے

پیام بر نہ میسّر ہوا تو خوب ہوا
زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

مری طرح سے مہ و مہر بھی ہیں آوارہ
کسی حبیب کی، یہ بھی ہیں جستجو کرتے

ہمیشہ میں نے گریباں کو چاک چاک کیا
تمام عمر رفوگر رہے ، رفو کرتے

نہ پوچھ ، عالمِ برگشتہ طالعی ، آتش
برستی آگ جو باراں کی آرزو کرتے

مشق

1- پہلی غزل میں ''راہ میں ہے'' ردیف ہے۔ آتش کی دوسری غزل میں ''ردیف'' کی نشان دہی کریں۔

2- شاملِ نصاب آتش کی غزلوں کو پیشِ نظر رکھ کر نیچے دیے گئے ہر سوال کے درست جواب پر (✓) لگائیے۔

i۔ مسافر نواز کسے کہا گیا ہے؟

ا۔ راہبر قافلہ کو ب۔ شجر سایہ دار کو ج۔ سامانِ سفر کو د۔ منزلِ مقصود کو

ii۔ ''عدم کے کوچ'' سے کیا مراد ہے؟

ا۔ دوسری دنیا کا سفر ب۔ زندگی کا سفر ج۔ عام سفر د۔ نجی سفر

iii۔ بدرقہ اور رفیق ساتھ نہ ہو تو کون کام آتا ہے؟

ا۔ اپنی ہمت ب۔ اپنی ذات ج۔ سامانِ سفر د۔ عنایت پروردگار

3- مختصر جواب دیں۔

i- آتش کی وجہ شہرت کیا ہے؟

ii- آتش کی دوسری غزل کے قافیے ترتیب وار لکھیں۔

iii- دوسری غزل کے مقطع کو پیشِ نظر رکھ کر بتائیں کہ آتش اپنی قسمت کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔

iv- اس غزل کے مطلع میں آتش نے کیا آرزو کی ہے؟

4- آتش کی دوسری غزل کے دوسرے شعر کی تشریح کریں۔

5- مندرجہ ذیل الفاظ وتراکیب کی وضاحت کریں۔

مسافر نواز، زبانِ غیر، ہوائے دورِ مئے خوش گوار، گل مراد، بدرقہ۔

6- آتش کی کوئی اور غزل لکھیں اور اس کا مطلع اور مقطع لکھنے کے بعد اس کے قافیے اور ردیف ترتیب وار لکھیں۔

میرزا خان داغؔ
(1831ء-1905ء)

(1)

پھرے راہ سے وہ ، یہاں آتے آتے
اجل مر رہی تُو ، کہاں آتے آتے

نہ جانا کہ دنیا سے جاتا ہے کوئی
بہت دیر کی ، مہرباں آتے آتے

سنانے کے قابل جو تھی بات ان کو
وہی رہ گئی ، درمیاں آتے آتے

مرے آشیاں کے تو تھے چار تنکے
چمن اُڑ گیا ، آندھیاں آتے آتے

نہیں کھیل اے داغؔ ! یاروں سے کہ دو
کہ آتی ہے اردو زباں ، آتے آتے

(2)

خاطر سے یا لحاظ سے ، مَیں مان تو گیا
جھوٹی قسم سے ، آپ کا ایمان تو گیا

دل لے کے مُفت کہتے ہیں کچھ کام کا نہیں
الٹی شکایتیں ہوئیں احسان تو گیا

ڈرتا ہوں دیکھ کر دلِ بے آرزو کو میں
سُنسان گھر یہ کیوں نہ ہو ، مہمان تو گیا

افشائے رازِ عشق میں گو ذلتیں ہوئیں
لیکن اسے جتا تو دیا جان تو گیا

گو نامہ بر سے خوش نہ ہوا پر ہزار شکر
مجھ کو وہ میرے نام سے ، پہچان تو گیا

بزمِ عدو میں صورتِ پروانہ دل مرا
گو رشک سے جلا تیرے قربان تو گیا

ہوش و حواس و تاب و تواں ، داغ ! جا چکے
اب ہم بھی جانے والے ہیں ، سامان تو گیا

مشق

1- مرزا داغ کی غزلوں کو ذہن میں لائیں اور درج ذیل مصرعے درست لفظ/الفاظ سے مکمل کریں۔

i- پھرے راہ سے............ آتے آتے۔

ا۔ درمیاں　　ب۔ وہ یہاں　　ج۔ ہم عناں

ii- اب ہم بھی جانے والے ہیں............ تو گیا۔

ا۔ میزبان　　ب۔ مہمان　　ج۔ سامان

iii- سنسان گھر یہ کیوں نہ ہو............ تو گیا۔

ا۔ انسان　　ب۔ سلطان　　ج۔ مہمان

2- ''اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا'' میں سامان کا مفہوم زیادہ سے زیادہ تین سطروں میں لکھیں۔

3- مندرجہ ذیل اشعار کی تشریح کریں۔

ے نہ جانا کہ دُنیا سے جاتا ہے کوئی
بہت دیر کی مہرباں آتے آتے

ے نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

ے ڈرتا ہوں دیکھ کر دلِ بے آرزو کو میں
سنسان گھر یہ کیوں نہ ہو، مہمان تو گیا

4- مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کی وضاحت کریں۔

دلِ بے آرزو، سنسان گھر، افشائے راز، نامہ بر، ہم عناں، اجل

5- دونوں غزلوں کے قوافی بالترتیب لکھیں۔

6- نصابی غزلوں کے علاوہ داغ کی کوئی اور غزل اپنی ڈائری میں لکھیں۔

مومن خاں مومن

(1800ء-1852ء)

(1)

اثر اس کو ، ذرا نہیں ہوتا
رنج ، راحت فزا نہیں ہوتا

ذکرِ اغیار سے ہوا معلوم
حرفِ ناصح بُرا نہیں ہوتا

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دُنیا میں کیا نہیں ہوتا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

حالِ دل یار کو لکھوں کیوں کر
ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا

چارۂ دل ، سوائے صبر نہیں
سو ، تمھارے سوا نہیں ہوتا

کیوں سنے عرضِ مضطرب ، مومن
صنم آخر خُدا نہیں ہوتا

(2)

ٹھانی تھی دل میں ، اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

ہنستے جو دیکھتے ہیں ، کسی کو کسی سے ہم
منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں ، کس بے کسی سے ہم

ہم سے نہ بولو تم ، اسے کیا کہتے ہیں بھلا
انصاف کیجیے پوچھتے ہیں ، آپ ہی سے ہم

بیزار جان سے جو نہ ہوتے تو مانگتے
شاہد شکایتوں پہ تیری مدعی سے ہم

بے روئے مثلِ ابر نہ نکلا غبارِ دل
کہتے تھے ان کو برقِ تبسم ہنسی سے ہم

کیا گُل کھلے گا ، دیکھیے ، ہے فصلِ گُل تو دُور
اور سُوئے دشت بھاگتے ہیں ، کچھ ابھی سے ہم

لے نام آرزو کا تو دل کو نکال لیں
مومن نہ ہوں ، جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

مشق

1- خالی جگہ پر کر کے مندرجہ ذیل اشعار مکمل کریں

i- چارۂ دل سوائے صبر نہیں
سو تمھارے .... نہیں ہوتا

ii- اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا
.... راحت فزا نہیں ہوتا

iii- ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہوگئے .... جی سے ہم

2- مختصر جواب دیں۔

i- مومن کی پہلی غزل کی ردیف کیا ہے؟

ii- مومن کی دوسری غزل کے قوافی لکھیں۔

iii- موحن کی پہلی غزل کا مطلع لکھیں۔

iv- مومن کی دوسری غزل کا مقطع لکھیں۔

3- تشریح کیجیے۔

i- تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ii- کیا گل کھلے گا دیکھیے ہے فصلِ گل تو دور
اور سوئے دشت بھاگتے ہیں کچھ ابھی سے ہم

4- مندرجہ ذیل الفاظ وتراکیب کا مفہوم لکھیں۔

سوئے دشت۔ ناچار۔ ربط۔ راحت فزا۔ صنم۔

5- مومن کی کوئی اور غزل اپنی ڈائری میں لکھیں۔

حسرت موہانی
(1875ء-1951ء)

(1)

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں
الٰہی ترکِ اُلفت پر، وہ کیوں کر یاد آتے ہیں

نہ چھیڑ اے ہم نشیں! کیفیتِ صہبا کے افسانے
شرابِ بے خودی کے، مجھ کو ساغر یاد آتے ہیں

نہیں آتی تو یاد اُن کی، مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں، تو اکثر یاد آتے ہیں

حقیقت کھل گئی حسرتؔ، ترے ترکِ محبت کی
تجھے تو اب وہ پہلے سے بھی، بڑھ کر یاد آتے ہیں

(2)

رسمِ جفا کامیاب، دیکھیے کب تک رہے
حُبِّ وطن مستِ خواب، دیکھیے کب تک رہے

دل پہ رہا مدّتوں، غلبۂ یاس و ہراس
قبضۂ حزم و حجاب، دیکھیے کب تک رہے

تا بہ کجا ہوں دراز، سلسلہ ہائے فریب
ضبط کی لوگوں میں تاب، دیکھیے کب تک رہے

پردۂ اصلاح میں، کوششِ تخریب کا
خلقِ خدا پر عذاب، دیکھیے کب تک رہے

حسرتِؔ آزاد پر، جورِ غلامانِ وقت
از رہِ بغض و عتاب، دیکھیے کب تک رہے

مشق

1- مختصر جواب دیں:

i- دونوں غزلوں میں ردیف کی نشان دہی کریں۔

ii- دونوں غزلوں میں کون کون سے قافیے استعمال ہوئے ہیں؟

iii- پہلی غزل کا مطلع لکھیں۔

2- درج ذیل اشعار میں اصطلاحی مفہوم کو مدنظر رکھتے ہوئے درست اصطلاح پر (✓) کا نشان لگائیں:

i- بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں
الٰہی ترکِ اُلفت پر وہ کیوں کر یاد آتے ہیں

(الف) مطلع (ب) مقطع (ج) غزل کا پہلا شعر (د) مطلع ثانی

ii- ''رسمِ جفا کامیاب دیکھیے کب تک رہے'' میں ''دیکھیے کب تک رہے'' ہے۔

(الف) مطلع (ب) مقطع (ج) قافیہ (د) ردیف

iii- ''حسرتِ آزاد پر جورِ غلامانِ وقت'' میں ''حسرت'' کیا ہے؟

(الف) قافیہ (ب) ردیف (ج) تخلص (د) مقطع

3- مندرجہ ذیل الفاظ وتراکیب کی وضاحت کریں۔

حبِ وطن، ترکِ الفت، غلبۂ یاس وہراس، تخریب

4- مندرجہ ذیل الفاظ کو اس طرح جملوں میں استعمال کریں کہ اُن کی تذکیروتانیث واضح ہو جائے:

خواب، حجاب، خبر، جفا، حُب

5- مندرجہ ذیل اشعار کی تشریح کیجیے۔

رسمِ جفا کامیاب دیکھیے کب تک رہے
حُبِ وطن مستِ خواب دیکھیے کب تک رہے
دل پہ رہا مدّتوں غلبۂ یاس و ہراس
قبضۂ حزم و حجاب دیکھیے کب تک رہے

6- حسرت موہانی کی کوئی اور غزل اپنی ڈائری میں لکھیں۔

فیض احمد فیضؔ

(1911ء - 1984ء)

(1)

نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش ، دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا جو بچے ہیں سنگ ، سمیٹ لو ، تنِ داغ داغ لٹا دیا
مرے چارہ گر کو نوید ہو ، صفِ دشمناں کو خبر کرو وہ جو قرض رکھتے تھے جاں پر ، وہ حساب آج چکا دیا
کرو کج جبیں پہ سرِ کفن ، مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو کہ غرورِ عشق کا بانکپن ، پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا
اُدھر ایک حرف کہ کُشتنی ، یہاں لاکھ عذر تھا گفتنی جو کہا تو سن کے اڑا دیا ، جو لکھا تو پڑھ کے مٹا دیا

جو رُکے تو کوہِ گراں تھے ہم ، جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہِ یار ہم نے قدم قدم ، تجھے یادگار بنا دیا

(2)

کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں ، کب ہات میں تیرا ہات نہیں صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں
مشکل ہیں اگر حالات وہاں ، دل بیچ آئیں جاں دے آئیں دل والو کوچۂ جاناں میں کیا ایسے بھی حالات نہیں
جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا ، وہ شان سلامت رہتی ہے یہ جان تو آنی جانی ہے ، اس جاں کی تو کوئی بات نہیں
میدان وفا دربار نہیں ، یاں نام و نسب کی پوچھ کہاں عاشق تو کسی کا نام نہیں ، کچھ عشق کسی کی ذات نہیں

گر بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا ، ہارے بھی تو بازی مات نہیں

مشق

1- درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگائیں۔

i- غزل نمبر 1 میں ردیف ہے۔

ا۔ دیا ب۔ گنوا ج۔ گنوادیا د۔ گنوا، لٹا

ii- فیض احمد فیض کی وجۂ شہرت ہے؟

ا۔ تنقید ب۔ مضمون نگاری ج۔ شاعری د۔ افسانہ نگاری

2- مندرجہ ذیل الفاظ وتراکیب کی وضاحت کریں۔

ناوکِ نیم کش، چارہ گر، غرورِ عشق کا بانکپن، کوہِ گراں، مقتل۔

3- قافیہ اور ردیف کی تعریف لکھیں اور فیض احمد فیض کی غزلوں سے ایک ایک مثال لکھیں۔

4- مطلع اور مقطع کا فرق واضح کریں اور مثال بھی دیں۔

5- مندرجہ ذیل اشعار کی تشریح کریں۔

ا۔ کرو کج جبیں پہ سرِ کفن مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن، پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا

ب۔ جو رُکے تو کوہِ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

ج۔ جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا، وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے، اس جاں کی تو کوئی بات نہیں

6- فیض احمد فیض کے کلام کا مطالعہ کریں اور دو ایسے اشعار لکھیں جن میں تلمیح یا تشبیہ موجود ہو۔

احمد ندیم قاسمی
(1916ء۔2006ء)

(1)

کچھ غلط بھی تو نہیں تھا ، مرا تنہا ہونا
آتش و آب کا ممکن نہیں ، یک جا ہونا

ایک نعمت بھی یہی، ایک قیامت بھی یہی
روح کا جاگنا اور آنکھ کا ، بینا ہونا

جو برائی تھی مرے نام سے منسوب ہوئی
دوستو! کتنا بُرا تھا مرا اچھا ہونا

قعرِ دریا میں بھی آ نکلے گی ، سورج کی کرن
مجھ کو آتا نہیں محرومِ تمنّا ہونا

شاعری روزِ ازل سے ہوئی تخلیق ، ندیمؔ
شعر سے کم نہیں ، انسان کا پیدا ہونا

(2)

اَب تو کچھ اور ہی ، اعجاز دکھایا جائے
شام کے بعد بھی سورج ، نہ بجھایا جائے

نئے انساں سے تعارف جو ہوا ، تو بولا
میں ہوں سقراط، مجھے زہر پلایا جائے

موت سے کس کو مفر ہے ، مگر انسانوں کو
پہلے جینے کا سلیقہ ، تو سکھایا جائے

حکم ہے سچ بھی قرینے سے کہا جائے ، ندیمؔ
زخم کو زخم نہیں ، پھول بتایا جائے

مشق

1- نیچے دیے گئے مصرعوں کو صحیح لفظ لگا کر مکمل کریں۔

i- کچھ غلط بھی تو نہیں تھا مرا.......... ہونا (تنہا۔ پیدا)

ii- مجھ کو آتا نہیں محروم..........ہونا۔ (تماشا۔تمنا)

iii- قعرِ دریا میں بھی آ نکلے گی..........کی کرن (سورج۔تارے)

iv- شاعری روزِ ازل سے ہوئی.......... ندیم (تعبیر۔تخلیق)

2- کالم الف اور کالم ب میں مطابقت قائم کیجیے اور جواب الگ کر کے لکھیں۔

کالم (الف)	کالم (ب)
i۔ شاعری روزِ ازل سے ہوئی تخلیق ندیم شعر سے کم نہیں انسان کا پیدا ہونا	مطلع
ii۔ یکجا۔ تنہا۔ پینا	ردیف
iii۔ کچھ غلط بھی تو نہیں تھا میرا تنہا ہونا آتش و آب کا ممکن نہیں یکجا ہونا	مقطع
iv۔ ہونا۔	قافیہ

3- درج ذیل اشعار میں سے قافیہ اور ردیف کی نشان دہی کریں۔

اب تو کچھ اور ہی اعجاز دکھایا جائے
شام کے بعد بھی سورج نہ بجھایا جائے
موت سے کس کو مفر ہے مگر انسانوں کو
پہلے جینے کا سلیقہ تو سکھایا جائے

4- دوسری غزل میں ''سقراط'' اصطلاحاً استعمال ہوا ہے۔اس اصطلاح کا نام لکھیں اور اس کی وضاحت کریں۔

5- دونوں غزلوں کے مقطع کی نشان دہی کریں۔

6- مندرجہ ذیل اشعار کی تشریح کریں۔

ایک نعمت بھی یہی ، ایک قیامت بھی یہی
روح کا جاگنا اور آنکھ کا بینا ہونا
موت سے کس کو مفر ہے مگر انسانوں کو
پہلے جینے کا سلیقہ تو سکھایا جائے

7- مندرجہ ذیل الفاظ وتراکیب کا مفہوم بیان کریں۔

قعرِ دریا، قیامت، ازل، اعجاز، آتش و آب

فرہنگ

نوٹ: الفاظ کے معانی بالعموم وہی دیے گئے ہیں جو اسباق کے متن سے مطابقت رکھتے ہیں

اسوۂ حسنہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

عالم گیر	دُنیا میں پھیلا ہوا
جود	بخشش، فیاضی
مسکنت	مسکینی۔ عاجزی
سیرت	طرزِ زندگی
رقیق القلبی	نرم دلی

اپنی مدد آپ

آزمودہ	تجربہ شدہ، آزمایا ہوا
پنسال	سنبل، پانی کی گہرائی معلوم کرنے کا آلہ
حاشا وکلا	ہرگز نہیں
نفس کشی	پرہیزگاری
نظیر	نمونہ، مثال

سرسید کے اخلاق وخصائل

بشاش	خوش
تعدّد	تعداد کے اعتبار سے زیادہ، کسی چیز کے ہونے کی تعداد
تلوّن	مختلف حالتوں میں ہونا، مراد ہے کہ رنگارنگی، مختلف اقسام کا ہونا
فواکہ	پھل
تصنع	بناوٹ
حد سے متجاوز ہونا	حد سے بڑھ جانا
غائر نظر	گہری نظر
کتاب دانی	کتاب کو سمجھنا
ہم سر	برابر کے
استعداد	قابلیت
قویٰ	قوتیں
جودت	عقل کی تیزی۔ ذہانت۔ لیاقت
ہم چشم	ہم مرتبہ، برابر والے
محنتِ شاقہ	سخت محنت
مغائرت	اجنبیت
تابمقدور	جہاں تک ممکن ہو، جہاں تک اپنے بس میں ہو
تسخیر کرلینا	رام کرلینا
شاق گزرنا	ناگوار معلوم ہونا، بُرا لگنا
راست بازی	سچائی
وابستگی	تعلق، محبت
موانست	اُنس، محبت
جبلی مہر ومحبت	فطری محبت
سفر وحضر میں	سفر اور قیام میں، سفر کی حالت میں بھی اور قیام کی حالت میں بھی
سیرچشمی	قناعت، فیاضی، بے پروائی
فراخ حوصلگی	حوصلہ وسیع ہونا
پس وپیش کرنا	ٹال مٹول کرنا

ابوالقاسم زہراوی

سربفلک	آسمان سے باتیں کرتی ہوئی، اونچی
سرجن	جراح
جلیل القدر	عظیم
عام فہم	آسان
موشگافیاں	باریکیاں
دست گاہ	مہارت
مہارتِ تامہ	مکمل رسائی

ادیب کی عزت

بساطی	چھوٹی چھوٹی چیزیں بیچنے والا
آہنی خود	لوہے کی ٹوپی جو جنگ میں سر کی حفاظت کے لیے استعمال ہوتی ہے

اوورکوٹ

خوش پوش	عمدہ لباس پہنے ہوئے
خراماں خراماں	ٹہلتا ہوا

حرکات وسکنات	اٹھنا بیٹھنا، ہلنا جلنا
متانت	سنجیدگی
استطاعت	توفیق
قماش	ڈھنگ، طرز، وضع
شانِ استغنا	بے نیازی، بے پروائی
پُراسرار	بھیدوں سے بھرا ہوا، جس میں کئی راز کی باتیں ہوں، عجیب
نمودار ہونا	اچانک ظاہر ہونا
منعطف کرنا	مبذول کرانا
بوسیدہ	گلاسڑا، بہت پُرانا
خجل	شرم سار، نادم

سفارش

رمق	ذراسی جان، تھوڑی سی چیز
ندامت	شرمندگی
ممنونیت	احسان مندی
اعتراف کرنا	مان جانا

چراغ کی لَو

آنگن	صحن
جی الٹنا	گھبراہٹ ہونا
جھونجھا ایسے بال	بے حد الٹے بال
کانکھنا	کراہنا

مکتوباتِ غالب

املاک	مِلک کی جمع، جائداد
پنسن	پنشن
تقصیر	غلطی
سرگزشت	حال، احوال
ذکر العیش	عیش کا ذکر، عیش وآرام کا تذکرہ
نصف العیش	آدھا عیش، آدھے عیش وآرام کے برابر
قناعت کرنا	جو میسر آجائے اسی پر صبر وشکر کرلینا
میعاد	مدت
ہنوز	ابھی تک
کاہلی	سستی
الملکُ للہ والحکم للہ	سلطنت اور حکومت اللہ کے لیے ہے
نجات	رہائی
اصلاح	درستی
فراہم ہونا	اکٹھا ہونا، ملنا
توشے خانے میں	پارچہ خانہ، امیروں کا لباس رکھنے کا کمرہ، سٹور بھی مراد لیا جاسکتا ہے
عافیت	خیریت
فصد ہونا	رگ سے خون نکلوانا
مسہل	قبض دور کرنے والی دوا
ناتواں	کمزور، ضعیف
صاحبِ فراش	بیمار، علیل

مکتوباتِ اقبالؒ

افاقہ	آرام
رفتنی	جانے والا
مصر ہونا	اصرار کرنا، ضد کرنا، بار بار تقاضا کرنا
آلام	دکھ، تکلیفیں
مطبوعہ	چھپا ہوا
علالت	بیماری
والا نامہ	گرامی نامہ، خط
لٹریچر	ادب

لاہور کا جغرافیہ

تمہید	آغاز، ابتدا، مقدمہ
دلائل	دلیل کی جمع،
فاتر	کمزور، ضعیف، سست
رفع کرنا	دور کرنا
اوّل الذکر	جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے
مؤخر الذکر	جس کا ذکر بعد میں ہوا ہے
اہلِ سیف	تلوار والے یعنی جنگ کرنے والے
یدِ طولیٰ رکھنا	پوری مہارت رکھنا
حدود اربعہ	چاروں طرفیں، چاروں طرفوں کے علاقوں کی تفصیل
عارضہ	بیماری
بحث وتمحیص	بحث مباحثہ

مفادِ عامہ — عام لوگوں کی بہتری، عوام کا فائدہ
بہم رسانی آب — پانی پہنچانا، پانی مہیا کرنا
تحقیق و تدقیق — کھوج اور غور و فکر
رائے دہندگی — رائے دینا
کماحقہٗ — جیسا کہ حق ہے، جیسا کہ ہونا چاہیے
دبازت — موٹائی، ضخامت
مژدہ — خوش خبری
عقبی دیوار — پچھلی دیوار
مطمحِ نظر — اصل مقصد
دساور — غیر ممالک، غیر ملک کی منڈی
مصاحب — ساتھی
جود و سخا — سخاوت، فیاضی
فروکش ہونا — قیام کرنا، رہائش پذیر ہونا، ٹھہرنا
آواگون — جُون بدلنا، مرنے کے بعد روح کا کسی دوسرے جسم میں آجانا
خرخشے — بکھیڑے، جھگڑے، پریشانیاں

کیا واقعی دنیا گول ہے

دھرتی — زمین
دھرتی کا گز بننا — بہت زیادہ سفر میں رہنا

نادیدہ — نہ دیکھا ہوا، اَن دیکھا
اوندھا — اُلٹا
دانشمند — عقل مند
پیر تسمہ پا — پیچھا نہ چھوڑنے والا
دمِ تحریر — لکھتے وقت، جب یہ تحریر لکھی جا رہی ہے
تھرل — انگریزی لفظ Thrill ہے، جوش و جذبہ
تلمذ — شاگردی
ٹنٹا — جھگڑا، فساد
خریطہ — تھیلی، وہ تھیلی جس میں سرکاری حکم جاتا ہے
بے غل و غش — بے دریغ، اندھا دھند، محنت و تکلیف کے بغیر
امان — پناہ
اجمال — اختصار، مختصر سا ذکر

اور آنا گھر میں مرغیوں کا

راسخ عقیدہ — پختہ عقیدہ، پکا یقین
ایثار — قربانی
پھوہڑ — جسے کوئی تمیز نہ ہو، بے سلیقہ
مفقود ہونا — بالکل نہ ہونا
نیم برشت — آدھا تلا ہوا، پوری طرح نہ تلا ہوا، (Half Boiled)
ردوقدح — بحث مباحثہ، تکرار

ماحصل — خلاصہ، لبِ لباب
مرغ بانی — مرغیاں پالنا
قنوطی — زندگی کا تاریک پہلو دیکھنے والا، مایوس، ہر طرح سے ناامید
قنوطیت — زندگی کا تاریک پہلو ہی دیکھنا، مایوسی، ناامیدی
ناحق — بلاوجہ
سادہ لوحی — سادگی
آسن — گھوڑے پر بیٹھنے کا طریقہ
مہاوت — فیل بان
داشت — دیکھ بھال
پرداخت — پرورش، دست گیری
جبلّی — فطری
سحر خیزی — صبح سویرے نیند سے جاگ جانا
درشتی سے — سختی سے، سخت لہجے میں
ورود و نزول — وارد ہونا، پہنچنا، آمد
ناقابلِ تردید — جسے رد نہ کیا جا سکے
ازراہِ تلطف — مہربانی کر کے
آلامِ دینوی — دنیا کے دکھ، دنیا کی تکالیف

حمد

خلوت — تنہائی
جلوت — خلوت کا متضاد، تنہائی نہ ہونا، سرِ عام ہونا

پنہاں	چھپا ہوا، پوشیدہ
عیاں	ظاہر
محرمِ راز	راز سے واقف
رازداں	راز جاننے والا

نعت

گریزاں	گریز کرنے والا، دور رہنے والا
صداقت	سچائی
اشکوں	آنسوؤں
دہر	زمانہ، دنیا
مروّت	رواداری، لحاظ
وابستۂ داماں	دامن سے وابستہ، دامن تھامے ہوئے

تسلیم و رضا

فقر	درویشی
افلاس	غربت، غریبی
ادبار	بدنصیبی، نحوست، مفلسی
جنجال	مصیبت، آفت
عالم	کیفیت
خرّم	خوش

میدانِ کربلا میں صبح کا منظر

زنگاری	سبز
گوہرِ یکتا	بے مثال جواہر
جواہر نگار	موتیوں کی طرح خوب صورت
تیہو	تیتر کی قسم کا ایک چھوٹا سا پرندہ
طاؤس	مور
درّاج	تیتر
کبک	چکور
مرغانِ خوش نوا	اچھی آواز والے پرندے، اچھی آواز میں چہچہانے والے پرندے
تھالے	درختوں کے گرد پانی دینے کے لیے بنائے ہوئے کم گہرائی کے گڑھے
نخل	درخت
سبد	ٹوکری، ٹوکرا
گہر ہائے آب دار	چمک دار موتی
بالائے نخل	درخت پر
خواہاں	چاہنے والے
حق سرّہٗ	اس کا راز سچ ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات حق ہے، یہ عارفوں اور درویشوں کا نعرہ ہے
علی العموم	عموماً
ربِّ علی	اللہ تعالیٰ
مدح	تعریف، حمد

مستقبل کی جھلک

کواکب	کوکب کی جمع، ستارے
کے عوض	بدلے میں، کی بجائے
انجم	ستارے
رخشندہ تر	زیادہ چمکنے والے، زیادہ روشن
دینِ متین	سنجیدہ دین، مضبوط دین، مراد ہے "اسلام"
استعمار	نوآبادیاں قائم کرنا، ہوس گیری کے جذبے سے دوسرے آزاد ممالک کو غلام بنانا
دارالحرب	جنگ کا گھر، دارالحرب اس ملک کو کہتے جہاں کافروں کی حکومت ہو مسلمانوں کو مذہبی فرائض کی ادائیگی سے روکا جا رہا ہو اور اس بنا پر وہاں جہاد کا حکم ہو، شاعر نے آزادی کے قبل کے ہندوستان کو دارالحرب کہا ہے
دارالامان	امن و امان کی جگہ
سودا	دیوانگی، جوش و جذبہ
بشارت	خوش خبری

برسات

- نیلی فام: نیلے رنگ کی
- خنداں: مسکراتا ہوا، کھِلا ہوا

ہلالِ استقلال

- استحکام: مضبوطی، پائیداری
- انگشت: انگلی
- پرتو: عکس
- نوید: خوش خبری
- عَلَم: جھنڈا
- سحابِ جُود: سخاوت کا بادل، بہت زیادہ سخاوت

خطاب بہ جوانانِ اسلام

- تدبر کرنا: غور کرنا، سوچنا
- گردوں: آسمان
- آغوش: گود
- تمدن آفریں: تمدن پیدا کرنے والا یعنی دنیا کو تہذیب سے آشنا کرنے والا
- خلاق: پیدا کرنے والا، بنانے والا
- جہاں داری: حکمرانی، حکومت کرنا
- شتربان: اونٹ پالنے والے، اونٹ چرانے والے، عرب لوگ مراد ہیں
- امارت: امیری
- گدائی: فقیری، بے سروسامانی
- منعم: امیر آدمی
- فزوں تر: بڑھ کر
- آبا: باپ دادا
- نسبت: تعلق
- گفتار: بولنا، مراد ہے ''باتیں ہی باتیں''
- کردار: عمل
- ثابت: ایک ہی مقام پر رکا ہوا
- سیّارا: متحرک
- اسلاف: باپ دادا، پچھلے بزرگ
- آئینِ مسلّم: مانا ہوا اصول طے شدہ اصول

پیغام

- آشنا: واقف
- باراں: بارش
- رہرو: راہی، مسافر
- اندیشہ: ڈر، خوف
- ناخدا: کشتی کھینے والا، ملاح
- محمل: کجاوہ، ایک خاص قسم کی ڈولی جو سواری کے لیے اونٹ پر باندھتے ہیں
- باطل: جھوٹ
- خاشاک: کوڑا کرکٹ
- غیر اللہ: اللہ تعالیٰ کے سوا یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا جو کچھ بھی ہے

ایبسٹریکٹ آرٹ

- ازراہِ مروّت: محض لحاظ ہی لحاظ میں
- ستائش: تعریف
- اطفال: طفل کی جمع، بچے

قطعات

- مفکّر: سوچ بچار کرنے والا
- فرمان: حکم
- شرع: قرآن وحدیث، اسلامی قانون

لوکل بس

- مرغِ گرفتار: پکڑا ہوا پرندہ
- گل بدن: پھولوں کے سے بدن والا، نازک بدن

وحدانیت

- وحدانیت: واحد ہونا، ایک ہونا، مراد ہے ''اللہ تعالیٰ کا واحد اور لاشریک ہونا''
- یکتا: اکیلا، بے نظیر
- سطوت: شان وشوکت
- ستّار: پردہ پوشی کرنے والا
- ساعت: گھڑی
- عصیاں: گناہ

غزل - میر

- مند جانا: بند ہو جانا
- وا ہونا: کھلنا

شِعار — طریقہ، چلن

شش جہت — چھے طرفین، مراد ہے ساری دنیا۔ چھے طرفین اس طرح بنتی ہیں: دائیں، بائیں، آگے، پیچھے، اوپر، نیچے

دوچار ہونا — ملاقات ہونا، آمنا سامنا ہونا

غزل - آتش

عدم — نہ ہونا، مراد ہے "دوسری دنیا جہاں مرنے کے بعد جانا ہے"

کوچ — سفر، روانگی

ہستی — ہونا، مراد ہے "زندگی"

بدرقہ — رہبر، رہنما

عنایتِ پروردگار — اللہ تعالیٰ کی مہربانی

غزل - آتش

خُوب ہوا — اچھا ہی ہوا

عالَم — کیفیت

برگشتہ طالعی — بدنصیبی

غزل - داغ

اجل — موت

نہیں کھیل — کوئی کھیل نہیں، کوئی آسان کام نہیں

خاطر — لحاظ، پاسداری

تاب و تواں — طاقت، حوصلہ، صبر و تحمل

غزل - مومن

راحت فزا — راحت کو جنم دینے والا، راحت کا سبب بننے والا

مضطرب — بے چین، بے قرار

غزل - مومن

ناچار — مجبور، بے بس

فصلِ گل — بہار کا موسم

گل کھلنا — کوئی بالکل نئی بات ہو جانا

سوئے دشت — جنگل کی طرف

ربط — تعلق، میل جول

بدعتی — بدعت کرنے والا، دین میں کوئی نئی بات نکالنے والا، فسادی، ظالم

غزل - حسرت

ہم نشیں — دوست

ترکِ الفت — محبت کو ختم کرنا

حقیقت کھل گئی — اصلیت سامنے آگئی

غزل - حسرت

یاس و ہراس — ناامیدی اور ڈر

حزم — احتیاط، دوراندیشی

ضبط — برداشت

جور — ظلم، ستم، سختی

بغض — کینہ، حسد، دشمنی

غزل - فیض

ناوکِ نیم کش — ادھ کھنچا تیر

چارہ گر — معالج

پسِ مرگ — موت کے بعد

کشتنی — مارے جانے کے قابل

گفتنی — بات جو کہنے کے قابل ہو

غزل - فیض

مقتل — قربان گاہ

ہجر — جدائی

غزل - احمد ندیم قاسمی

آتش و آب — آگ اور پانی

بینا — دیکھنے والا

قعرِ دریا — دریا کی گہرائی

روزِ ازل سے — اوّل روز سے، ابتدا ہی سے

غزل - احمد ندیم قاسمی

اعجاز — معجزہ

مفر — جائے فرار، چارۂ کار

پنجاب کریکولم اینڈ ٹیکسٹ بک بورڈ منظور شدہ نصاب کے مطابق معیاری اور سستی کُتب مُہیا کرتا ہے۔ اگر ان کُتب میں کوئی تصور وضاحت طلب ہو، متن اور اِملاء وغیرہ میں کوئی غلطی ہو تو گزارش ہے کہ اپنی آراء سے آگاہ فرمائیں۔ ادارہ آپ کا شکر گزار ہوگا۔

منیجنگ ڈائریکٹر
پنجاب کریکولم اینڈ ٹیکسٹ بک بورڈ
21-ای-II، گلبرگ-III، لاہور۔

فیکس نمبر: 042-99230679
ای میل: chairman@ptb.gop.pk
ویب سائٹ: www.ptb.gop.pk

Printed by: Maryah Printers Islamabad
sales@maryahprinters.com

Designed By: ART CELL PCTB

امانت
دیانت
صداقت
شرافت

پنجاب
کریکولم اینڈ
ٹیکسٹ بک بورڈ
لاہور

پنجاب کریکولم اینڈ ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور